انشورنس

[مجموعہ مقالات مجلس تحقیقات شرعیہ ۱۹۶۵ء]

مرتب

مسعود حسن حسنی ندوی

(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

ناشر

مجلس تحقیقات شرعیہ

انشورنس

زندگی

صحت

تجارت

گھر

کار

سفر

ذمہ داری

انشورنس

مرتب مسعود حسن حسنی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

ناشر

مجلس تحقیقات شرعیہ

Printed by Maktaba Ahsan, Lucknow Mob: 9335982413

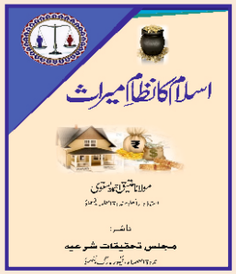

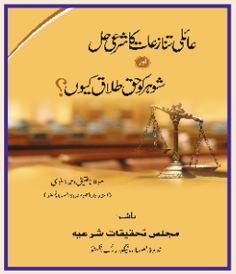

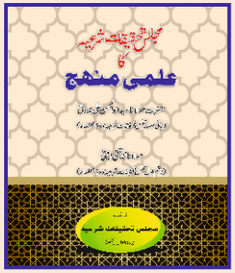

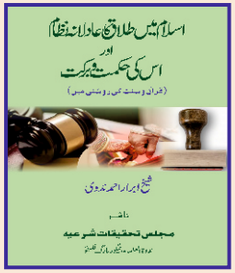

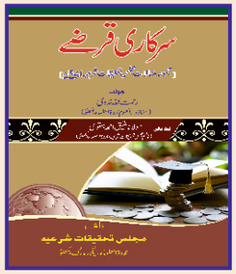

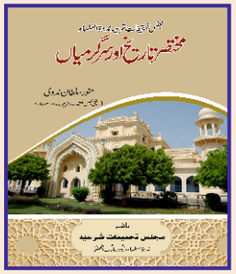

ناشر:

مجلس تحقیقات شرعیہ

انشورنس

[مجموعہ مقالات مجلس تحقیقات شرعیہ ۱۹۶۵ء]

مرتب

مسعود حسن حسنی ندوی

(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

نظرِ ثانی

مولانا عتیق احمد بستوی

(ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

ناشر

مجلس تحقیقات شرعیہ

ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ، لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	: انشورنس
ترتیب وتحقیق	: مسعود حسن حسنی ندوی
نظرِ ثانی	: مولانا عتیق احمد بستوی
کل صفحات	: ۲۳۶
سن اشاعت	: اکتوبر ۲۰۲۲ء
تعداد	: ۵۰۰
قیمت	: /روپے

ناشر

مجلس تحقیقات شرعیہ

ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ، لکھنؤ

ملنے کے پتے:

۱- مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، احاطہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون: 0522.2741439

۲- مکتبہ ندویہ، احاطہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، فون: 8960997707

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحات
۱	مقدمہ: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم	۵
۲	پیش لفظ: مولانا عتیق احمد بستوی (ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ، لکھنؤ)	۸
۳	عرض مرتب	۱۶
۴	مسئلہ بیمہ: تاریخ وتعارف مولانا تقی امینی صاحب	۲۴
۵	بیمہ زندگی کے دو شعبے: صنعتی اور عمومی	۲۸
۶	سوال نامہ متعلق انشورنس (مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلویؒ کنوینر مجلس تحقیقات شرعیہ، لکھنؤ)	۷۷
۷	جواب: مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (دارالعلوم کراچی، پاکستان)	۸۷
۸	جواب: مولانا ولی حسن ٹونکی (مدرسہ عربیہ کراچی)	۹۹
۹	جواب: مولانا یوسف بنوری صاحبؒ	۱۴۴
۱۰	جواب: مفتی محمود حسن صاحب (مدرسہ جامع العلوم پٹکاپور، کانپور)	۱۴۵
۱۱	جواب: مولانا مفتی مہدی حسن صاحب (دارالافتاء، دیوبند)	۱۵۳
۱۲	جواب: مولانا محمد ہارون بلوچستانی (دارالافتاء دارالعلوم الاسلامیہ، ٹنڈوالہ یار، پاکستان) مع تصویب مولانا ظفر احمد عثمانی	۱۵۶
۱۳	جوب: مولانا یحییٰ قاسمی (مفتی دارالافتاء، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ)	۱۵۸
۱۴	جواب: مفتی محمد ظفیر الدین (دارالعلوم دیوبند) مع تصدیق مولانا فخر الحسن صاحب	۱۷۲
۱۵	جواب: مولانا مظفر حسین المظاہری (دارالافتاء مظاہر علوم سہارنپور)	۱۸۰

۱۶	جواب: مولانا عبید اللہ رحمانی (مبارکپوری)	۱۹۱
۱۷	جواب: مولانا سید عروج احمد قادری (مدیر ماہنامہ 'زندگی'، رامپور)	۲۰۴
۱۸	جواب: مولانا عبد السلام ندوی (جامعہ ملیہ، نئی دہلی)	۲۱۱
۱۹	جواب: مولانا محمد میاں صاحب (مقالات کا تجزیہ)	۲۱۳

دیگر تحریریں:

۱	مکتوب قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند)	۲۱۶
۲	مکتوب مولانا عبد الماجد دریابادی	۲۱۸
۳	مکتوب پروفیسر عبد الوہاب بخاری (نیو کالج، مدراس)	۲۱۹
۴	مکتوب مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری	۲۲۱
۵	تجویز: مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ	۲۲۲
۶	ملک کے موجودہ حالات میں بیمہ (انشورنس) کا شرعی حکم	۲۲۵
۷	جواب: مولانا حبیب الرحمٰن خیرآبادی (مفتی دارالعلوم، دیوبند)	۲۲۸
۸	تجویز نمبر-۶، بیمہ پالیسی	۲۳۱
۹	تجویز نمبر-۱، میڈیکل انشورنس اور اس کی چند شکلیں	۲۳۲
۱۰	تجویز-۳، میڈیکل (ہیلتھ) انشورنس	۲۳۴
۱۱	اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا فیصلہ	۲۳۵
۱۲	۲-میڈیکل انشورنس	۲۳۶

☆☆☆

مقدمہ

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین، وخاتم النبیین محمد بن عبد اللّٰہ الأمین، وعلی آلہ وصبحہ أجمعین، أما بعد!

اسلام دین کامل ہے، خاتم الأنبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جو دین نازل ہوا وہ قیامت تک کے لئے انسانوں کی رہنمائی کے لئے کافی ہے، کتاب وسنت میں جو اصول وتعلیمات درج ہیں ان کی روشنی میں ہر دور کے نت نئے مسائل کا شرعی حل نکالا جاسکتا ہے، چنانچہ فقہاء امت نے دنیا کے مختلف ممالک میں پیش آنے والے مسائل کا حل کتاب وسنت اور ادلۂ شرعیہ کی روشنی میں پیش کیا، اور انسانیت کی ہمہ جہت رہنمائی فرمائی، دور نبوی اور دور صحابہ سے لے کر دورِ حاضر تک نئے مسائل کے بارے میں حکم شرعی دریافت کرنے کے لئے انفرادی اور اجتماعی سطح پر کامیاب کوششیں ہوتی رہیں، اور اس کے نتیجے میں فقہ اسلامی کا عظیم الشان سرمایہ تیار ہوا، جس کی نظیر دنیا کی کسی دوسری قوم اور کسی دوسرے مذہب والوں کے یہاں نہیں ملتی۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر ہندوپاک کو انگریزوں سے آزادی ملی، لیکن اسی کے ساتھ تقسیم ہند کا حادثہ بھی پیش آیا، جس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان ایسے سنگین اور خطرناک حالات سے دوچار ہوئے جن کا تصور بھی ان کے دل ودماغ میں نہیں تھا، تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی مسلم قیادت سیاسی طور پر انتہائی کمزور ہوگئی، لاکھوں مسلمان شہید ہوئے، آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود خطرے میں پڑ گیا، فسادات کا نہ تھمنے والا سلسلہ ان کے سامنے تھا، فوری ضرورت اس چیز کی ہوئی کہ مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو کا تحفظ کیا جائے، اور ہندوستان میں ان کے قدم جمائے جائیں۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کی ایک شرعی ضرورت یہ بھی تھی کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو جو چیلنجز درپیش ہیں، اور جس طرح کے پیچیدہ مسائل کا سامنا ہے، ان کا شرعی حل تلاش کیا جائے، اور معتبر علماء اور ممتاز فقہاء کی کوئی مجلس اجتماعی غور وخوض کے لئے قائم کی جائے جو ان کا شرعی حل پیش کرے۔

اس ضرورت کا احساس کر کے جن بزرگوں نے قدم بڑھانے کا فیصلہ فرمایا ان میں سرفہرست مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، اور اس کام میں ان کی بھرپور معاونت کرنے والے بزرگوں میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ مدیر ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ، حضرت مولانا شاہ منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی وغیرہم رحمہم اللہ تھے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی دعوت پر یکم ستمبر ۱۹۶۳ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ملک کے منتخب اہل فکر علماء کا ایک مشاورتی جلسہ ہوا تھا، جس میں نئے حالات سے پیدا ہونے والے مسائل پر شرعی نقطۂ نظر سے غور وخوض اور ملت کی رہنمائی کرنے کے لئے مجلس تحقیقات شرعیہ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا، مجلس کے مقاصد، طریقہ کار وغیرہ طے کئے گئے۔

چند سال تک مجلس تحقیقات شرعیہ بہت متحرک اور فعال رہی، متعدد اہم موضوعات پر اس کی مشاورتی میٹنگیں ہوئیں، انشورنس، رویت ہلال، سرکاری قرضوں وغیرہ پر ہندوپاک کے ممتاز علماء اور فقہاء سے مقالات لکھوائے گئے، فتاوی حاصل کئے گئے، اور مشاورتی میٹنگوں میں غور وخوض کے بعد فیصلے کئے گئے، ۱۹۷۱ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ کی پانچویں مشاورتی نشست ہوئی، جو سرکاری قرضوں کے موضوع پر تھی، بعض اسباب کی بنیاد پر اس کے بعد کوئی مشاورتی نشست منعقد نہ ہوسکی، اگرچہ مجلس تحقیقات شرعیہ اس کے بعد بھی قائم رہی، اور جناب مولانا برہان الدین سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ اس کے تحت نئے مسائل پر تحقیق وتصنیف کا کام کرتے رہے، لیکن اجتماعی غور وخوض اور فیصلے کا کام موقوف رہا۔

دوڈھائی سال قبل دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ مجلس تحقیقات شرعیہ کو دوبارہ

ماضی کی طرح متحرک کیا جائے، اوراس کے ذریعہ نئے مسائل پر اجتماعی غور وخوض کے سلسلہ کا آغاز کیا جائے، جناب مولانا برہان الدین سنبھلی کئی سال سے مکمل معذوری کی حالت میں تھے، اس لئے اس کام کی ذمہ داری دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا عتیق احمد بستوی کے ذمہ کی گئی، انہیں مجلس تحقیقات شرعیہ کا ناظم مقرر کیا گیا، اورالحمدللہ جب سے ان پر یہ ذمہ داری آئی ہے اور چند اساتذہ کو ان کا معاون نامزد کیا گیا ہے، مجلس تحقیقات شرعیہ دوبارہ متحرک ہوئی ہے۔

اس مدت میں ایک کام یہ ہوا ہے کہ جن موضوعات پر مجلس تحقیقات شرعیہ کے ابتدائی چند سالوں میں مشاورتی میٹنگیں یا مذاکرہ کی مجلسیں ہوئیں ان پر مقالات وفتاوی حاصل کئے گئے، انہیں نئے انداز سے شائع کرنے کے لئے مرتب کرایا گیا، تاکہ چوٹی کے اہل علم کی یہ علمی اور فقہی تحریریں شائع ہوکر وقف عام ہوسکیں، اوراہل علم ان سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔

مجھے بیحد مسرت ہے کہ مجلس تحقیقات شرعیہ کے تحت انشورنس کے موضوع پر مقالات، فتاوی اور دیگر تحریرات کی ترتیب وتحقیق کا کام مولانا عتیق احمد بستوی کی نگرانی میں عزیز گرامی مولوی مفتی مسعود حسن حسنی سلمہ اللہ (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے انجام دیا ہے، بوسیدہ اوراق کو پڑھنا، اصل حوالوں کی طرف مراجعت اوران کی درستگی نیز ناتمام حوالوں کی تکمیل آسان کام نہیں ہے، عزیز مکرم نے اس کام کو پوری عرق ریزی، محنت اور دیدہ ریزی سے بہتر طور پر کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے اس علمی کام کو قبول فرمائے، اورانہیں مزید تحقیقی وتصنیفی کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔

مجلس تحقیقات شرعیہ کے ناظم جناب مولانا عتیق احمد بستوی صاحب جن کی نگرانی میں یہ سارے کام انجام پارہے ہیں ان کو بھی مبارکباد دیتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ مجلس تحقیقات شرعیہ کو اللہ تعالی ترقیات سے نوازے، اوراس کے ذریعہ نئے مسائل پر اجتماعی غور وخوض کا سلسلہ دوبارہ جاری اور قائم ہو۔

۵/ربیع الاول ۱۴۴۴ھ
۲/اکتوبر ۲۰۲۲ء

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

پیش لفظ

الحمدلله رب العالمين، والصلاة والسلام على خاتم الانبياء والمرسلين محمد بن عبد الله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين ومن تبعهم ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين، أما بعد!

اسلام دینِ کامل ہے، اس میں زندگی کے تمام شعبوں اور ہر طرح کے حالات کے لئے رہنمائی موجود ہے، خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہونے والا دین خاتم الادیان ہے، قیامت تک کے لئے یہی دین اللہ کا پسندیدہ دین ہے، اس کی پیروی کرکے اوراسی پر چل کر دین ودنیا کی فلاح اور آخرت کی نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

اللہ جل شانہٗ نے خاتم الانبیا ﷺ کو بڑے واضح الفاظ میں تکمیل دین وشریعت کی بشارت سنائی، ارشار باری ہے:

﴿اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا﴾

قیامت تک کے لئے خاتم الانبیا ﷺ پر نازل ہونے والی شریعت اللہ کی پسندیدہ شریعت ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

”لو كان موسى حيا ما وسعه الإ إتباعي“

(اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لئے میری پیروی کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا)

دورِ اخیر میں جب حضرت عیسیٰؑ نزول فرمائیں گے تو شریعت محمدی پر عمل کریں گے اور اسی پر عمل کرنے کا حکم دیں گے۔

اسلام چونکہ قیامت تک کے لئے راہِ ہدایت ہے اور تمام سابقہ آسمانی شریعتوں کو منسوخ کرنے والا ہے، اس لئے قرآن وسنت کی تعلیمات میں ایسی جامعیت ہے کہ انسانی

زندگی کا ہر شعبہ اس کے دائرے میں آجاتا ہے، اور کتاب وسنت سے اس کے بارے میں بنیادی ہدایات مل جاتی ہیں، اور اسلامی شریعت میں ایسی لچک ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات میں انسانوں کے رہنمائی کے لئے کافی ہے، اس لئے ائمہ سلف اور فقہائے امت نے کتاب وسنت کی روشنی میں اپنے اپنے دور کے نئے مسائل کا شرعی حل پیش کیا اور ہر طرح کے حالات میں امت کی رہنمائی فرمائی۔

خود قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں اختیاری حالات اور اضطراری حالات دونوں کے احکام موجود ہیں، شریعت کے اصل حکم پر عمل آوری دشوار ہونے کی صورت میں خود شریعت نے اس کا متبادل متعین فرمایا ہے، مثلاً وضو پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں یا پانی دستیاب نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کرنے کا حکم، اسی طرح مشقت کے حالات میں حکم میں تسہیل اور تخفیف، مثلاً سفر اور مرض کی حالت میں احکام میں تخفیف۔

اللہ کا فضل ہے کہ علمائے امت اور فقہائے عصر نے ہر دور میں نئے پیش آمدہ مسائل یا قدیم مسائل جو نئے حالات میں غور وخوض کا تقاضا کرتے تھے، ان پر غور وخوض اور باہمی تبادلہ خیالات کا سلسلہ جاری رکھا، اور کتاب وسنت کی تصریحات وارشادات نیز مقاصد شریعت کی روشنی میں ان مسائل پر غور وخوض کر کے امت کی رہنمائی فرمائی، اس طرح فقہ اسلامی ایسا عظیم قانونی سرمایہ بن گیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، فقہ اسلامی کی وسعت، جامعیت لوگوں کے حالات وضروریات سے مطابقت اس کے مسائل میں عدل وانصاف کے تقاضوں کی مکمل رعایت یہ ایسی خوبیاں ہیں کہ کسی دوسرے مجموعۂ قانون میں نہیں ملتیں۔

ہر صغیر ہندو پاک میں تقسیم ملک کے بعد جو خونی خوفناک حالات پیدا ہوگئے، ان کا مطالعہ کرنے سے بھی انسان لرز جاتا ہے، ہمارے بزرگوں نے ملک کے آزادی کے جو سہانے خواب دیکھے تھے وہ سب تقسیم ملک کے نتیجے میں چکنا چور ہوگئے، لاکھوں لوگ شہید کر دیئے گئے، ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں باقی رہنے والے بہت سے علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور ان کا غلبہ تھا وہ مسلمانوں سے خالی ہوگئے، مسلمانوں کی

اکثریت شہید کر دی گئی یا وہاں سے منتقل ہوگئی، جو لوگ کسی مجبوری کی وجہ سے پاکستان منتقل نہیں ہو سکے ان میں سے ایک بڑی تعداد جان بچانے کے لئے ارتداد کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئی، ہندو فرقہ پرست طاقتیں طاقت ور ہوتی گئیں انہیں اس ملک میں مسلمانوں کا وجود ہی قبول نہیں تھا، چہ جائیکہ ان کے حقوق پر غور کریں، ملک کے مختلف علاقوں میں فسادات کا سلسلہ پھوٹ پڑا جس میں مسلمانوں کا جانی اور مالی نقصان ہوا۔

تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کی حکومت اگرچہ کانگریس کے ہاتھ میں آئی جو اپنے کو ایک سیکولر، سوشلسٹ اور جمہوری پارٹی کہتی تھی لیکن کانگریس کے قائدین میں بھی فرقہ پرست عناصر کی خاصی تعداد تھی، جو حکومت کی پالیسیاں مرتب کرنے میں بہت اثر انداز تھے، تقسیم ملک کے نتیجے میں مسلم قیادت کی طاقت تو ٹوٹ چکی تھی، حکومت ان کے مطالبات پر زیادہ توجہ نہیں دیتی تھی، طفل تسلیوں اور جھوٹے وعدوں سے کام لیتی تھی، کانگریس کے حکومت کی سیاسی، معاشی، انتظامی پالیسیاں دن بدن مسلمانوں کو کمزور کر رہی تھیں اور ان کا وزن گھٹا رہی تھیں۔

سب سے بڑا مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جان ومال کے تحفظ کا تھا جس کے بارے میں مسلمان قائدین خصوصا علماء بہت پریشان تھے، اور اس کی راہیں تلاش کر رہے تھے، بہت سے علماء کو یہ خیال ہوا کہ سرکاری اور نیم سرکاری انشورنس کمپنیاں جو جان یا مال کا بیمہ کرتی ہیں شاید ان کا سہارا لے کر مسلمانوں کے جان ومال کا کچھ تحفظ ہوسکتا ہے، اور مسلمانوں کو پہونچنے والے نقصان کی کسی حد تک تلافی ہوسکتی ہے، یہ احساس تو تقریباً تمام علماء کو تھا کہ ان بیمہ کمپنیوں کی مروّجہ اسکیمیں عموماً سود، قمار وغیرہ پر مشتمل ہیں، جو شریعت میں ممنوع ہے، لیکن اسلامی شریعت میں تحفظ جان ومال کی جو اہمیت ہے اس کے پیشِ نظر بہت سے علماء نے انشورنس کے مسئلے پر اس انداز سے سوچنا شروع کیا کہ فسادات کے موقع پر چونکہ حکومت جان ومال کے تحفظ کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتی، بلکہ بسا اوقات حکومت کی مشنری فرقہ پرستوں کو شہ دے کر یا ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی جان ومال کو بڑے پیمانے پر نقصان پہونچاتی ہے، اور عام طور سے بڑی انشورنس کمپنیاں

گورنمنٹ کی ہیں اس لئے ہوسکتا ہے کہ حکومت اپنے کو نقصان سے بچانے کے لئے حالات پر قابو پانے اور امن قائم کرنے کی کوشش کرے، مجرموں کو کیفر کردار تک پہونچائے، اور جان و مال کا نقصان ہوجانے کی صورت میں انشورنس کرانے کی صورت میں اس کی امید ہے کہ نقصان کی کسی حدتک تلافی ہوجائے۔

اس پس منظر میں ہندوستان کے علماء میں انشورنس کے مسئلے پر غور وخوض شروع ہوا، چند بڑے علماء جو ہندوستان کے حالات سے بڑے پریشان اور فکرمند تھے، انہوں نے اس مسئلے پر اجتماعی غور وخوض کا فیصلہ کیا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ مدیر الفرقان لکھنؤ، حضرت مولانا شاہ منت اللہ رحمانی خانقاہ مونگیر، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن وغیرہم نے نئے پیش آمدہ مسائل پر اجتماعی غور وخوض کے لئے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں نئے مسائل پر بحث وتحقیق کے لئے ۱۹۶۳ء میں ایک ادارے کی داغ بیل ڈالی جس کا نام ''مجلس تحقیقات شرعیہ'' رکھا گیا اور مجلس تحقیقات شرعیہ میں جو موضوع سب سے پہلے غور وخوض کے لئے طے کیا گیا تھا وہ انشورنس کا موضوع تھا۔

مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کے پہلے صدر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، اور اس کے ناظم حضرت مولانا محمد تقی امینی رحمۃ اللہ علیہ طے پائے، انہوں نے انشورنس کے موضوع پر مواد جمع کرنے، بنیادی معلومات فراہم کرنے اور عالم اسلام میں انشورنس کے بارے میں علماء کے مختلف نقطہائے نظر اور ان کے دلائل کو سلیقے سے جمع کرنے کا کام انجام دیا لیکن وہ جلد ہی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات میں منتقل ہوگئے، ناظم دینیات کے طور پر وہاں خدمات انجام دینے لگے، ان کے علی گڈھ منتقل ہونے کے بعد یہ ذمہ داری حضرت مولانا محمد اسحاق سندیلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کی گئی، انہوں نے پوری مستعدی سے فقہی معلومات مرتب کرکے انشورنس کے موضوع پر سوالنامہ تیار کیا اور ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز علماء اور اصحاب افتاء کی خدمت میں سوالنامہ بھیجا اور جوابات کے لئے تقاضے کئے۔

ملک کی آزادی اور تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے مسلمان جن نازک اور خطرناک حالات سے گذر رہے تھے ان کے پیش نظر مسلمانوں کی جان و مال وغیرہ کے تحفظ کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کرچکا تھا، علماء، اصحاب افتاء اور اہل فکر ودانش اس کے لئے فکرمند اور پریشان تھے، اسی لئے جب مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی طرف سے انشورنس کے موضوع پر سوال نامہ جاری ہوا، اور علماء کرام نیز اصحاب افتاء کو علم ہوا کہ اس موضوع پر اجتماعی خور وغوض کی تیاری ہے، اور مجلس تحقیقات شرعیہ کا ارادہ انشورنس کے موضوع پر اجتماعی مذاکرہ کرنے اور اس بابت فیصلہ کرنے کا ہے، تو چوٹی کے فقہاء اور اصحاب افتاء نے سوالنامہ کے جوابات تحریر کئے، اور دلائل کی روشنی میں اپنا موقف واضح کیا۔

ہندوستان کے مرکزی مدارس کے مفتیان کرام اور فقہ وافتاء کی اہم شخصیات کے علاوہ پڑوسی ملک پاکستان کے بھی چند ممتاز ترین مفتیان کرام وفقہاء نے اپنی تفصیلی تحریریں ارسال فرمائی، مؤرخہ ۱۵، ۱۶ دسمبر ۱۹۶۵ء کو انشورنس کے موضوع پر اجتماعی غور وخوض اور فیصلے کے لئے مجلس مذاکرہ بلائی گئی، اور متعدد نشستوں میں اجتماعی غور وخوض کے بعد درج ذیل فیصلہ کیا گیا:

> ''مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے ربوا وقمار لازم ہے، اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اسلامی اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب ہے، لیکن جان و مال کے تحفظ وبقا کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے، مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے، نیز مجلس اس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کرسکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی راستوں سے انشورنس انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہوگیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں، اور جان و مال کے تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائیداد کا بیمہ کرائے تو مذکورہ بالا

علماء کرام کے قول کی بناء پر شرعا اس کی گنجائش ہے۔''

اس فیصلہ پر درج ذیل علماء نے دستخط کیے:

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا مفتی محمد ظفیر الدین (دارالعلوم دیوبند)، مولانا ابواللیث ندوی (امیر جماعت اسلامی ہند)، مولانا محمد رضا انصاری (مفتی فرنگی محل)، مولانا شاہ معین الدین ندوی (دارالمصنفین اعظم گڑھ)، مولانا فخر الحسن صاحب (استاذ دارالعلوم دیوبند)، مولانا شاہ عون احمد قادری (سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف)، مولانا منت اللہ رحمانی (سجادی نشیں خانقاہ مونگیر)، مولانا محمد اویس ندوی (شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء)، مولانا محمد منظور نعمانی (مدیر الفرقان، لکھنؤ)، مولانا سعید احمد اکبر آبادی (صدر شعبہ دینیات علی گڑھ)، مولانا محمد اسحٰق ندوی سندیلوی۔

(مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء، مختصر تاریخ اور تشکیل نو کا خاکہ، مرتب: منور سلطان ندوی، ص: ۳۳ تا ۳۴)

اخبارات ورسائل میں انشورنس کے بارے میں مجلس تحقیقات شرعیہ کے فیصلے کا اعلان کیا گیا، بہت سے حضرات نے اس فیصلہ کی تحسین کی، اور اسے موجودہ حالات کا تقاضا قرار دیا، اور بعض حضرات نے اس فیصلہ سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے دلائل پیش کئے۔

یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں انشورنس کے بارے میں اب تک جواز اور گنجائش کے جو بھی انفرادی یا اجتماعی فتاوی دئے گئے ہیں، ان سب میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ انشورنس کے موجودہ نظام میں جو شکلیں رائج ہیں ان میں متعدد شرعی ممنوعات پائے جاتے ہیں، مثلاً سود، قمار، غرر وغیرہ، لہذا اصلاً انشورنس کرانا خواہ جان کا ہو یا مال کا شرعاً درست نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں چونکہ مسلمانوں کی جان ومال کا تحفظ خطرے میں ہے، اور بکثرت فسادات ہوتے رہتے ہیں، جن میں مسلمانوں کی جان ومال کا زیاں ہوتا ہے، اور بڑے نقصانات ہوتے ہیں، اور انشورنس کرانے سے کسی حد تک یہ امید کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کی جان ومال کو تحفظ حاصل ہو، اور ان کے نقصان کی تلافی ہو، اس لئے ضرورت کی بنیاد پر انشورنس کرانے کی گنجائش دی جاتی ہے، جیسا کہ مجلس تحقیقات شرعیہ

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فیصلہ سے واضح ہے۔

مسلمانوں کی جان ومال وغیرہ کو جو خطرات ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد لاحق ہوئے تھے وہ خطرات کم وبیش آج بھی موجود ہیں، بلکہ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ ان خطرات کی سنگینی اور بڑھتی جارہی ہے، ہندو طاقتوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے حالات کی سنگینی اور خطرناکی مزید بڑھ گئی ہے۔

انشورنس کے موضوع پر مجلس تحقیقات شرعیہ کی تحریک ودعوت پر جو مقالات اور فتاوی تحریر کئے گئے وہ اب تک شائع نہیں ہوئے تھے، تقریباً ڈھائی سال پہلے جب ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم نے مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کو از سر نو متحرک کرنے کا فیصلہ فرمایا تو یہ طے کیا گیا کہ مجلس تحقیقات شرعیہ کے تحت جن موضوعات پر اجتماعی مذاکرات ہو چکے ہیں ان کے بارے میں لکھے گئے مقالات وفتاوی جو مجلس کو موصول ہوئے تھے انہیں کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے، تاکہ یہ علمی اور فقہی امانت اہل علم کے حوالہ ہو جائے، اور لوگ اس سے استفادہ کر سکیں،

انشورنس پہلا وہ موضوع تھا جس پر سوالنامہ جاری کیا گیا، مقالات وجوابات آئے، یہ مقالات وجوابات مجلس تحقیقات شرعیہ کے آفس میں محفوظ تھے، لیکن بہت بوسیدہ حالت میں تھے، کیونکہ ان کاغذات پر تقریباً ۵۸ سال گذر چکے تھے، ان بوسیدہ اوراق کو پڑھنا خود ایک مشکل کام ہے، یہ ذمہ داری مولانا مفتی مسعود حسن حسنی زید مجدہ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء (جو دارالافتاء، ندوۃ العلماء میں فتوی نویسی کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں) کو دی گئی، انہوں نے بڑی توجہ اور عرق ریزی سے ان تحریروں کو پڑھا، جن کتابوں سے عبارتیں لی گی تھی ان سے مراجعت کی، حوالہ جات کی تکمیل کی، اور بعض مقامات پر حواشی لکھے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، علم وعمل میں برکت دے، اور اس اہم علمی کام کو ان کے علمی تحقیقی کاموں کا بہترین آغاز بنادے۔

ان کے قلم سے لکھے گئے عرض مرتب میں ان کی علمی کاوشوں کی ایک جھلک آپ کو نظر آئے گی، اس میں ان علماء اور فقہاء کی فہرست بھی ہے جن کی تحریریں اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

اس مجموعہ کی افادیت میں اضافہ کرنے کے لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ انشورنس کے موضوع پر ہندوستان کے دومؤقر اداروں (اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، ادارۂ مباحث فقہیہ جمعیت علماء ہند) نے جو فیصلے کئے ہیں انہیں بھی شامل کردیا جائے، تاکہ اہل علم کو واقفیت ہو کہ انشورنس کے موضوع کا سفر کہاں تک پہنچا ہے، اور فقہی موضوعات پر اجتماعی غور وخوض کرنے والے اداروں نے حالات وضروریات کے تحت کیا کیا فیصلے کئے ہیں۔

ہماری دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک میں مکمل امن وامان قائم کرے، ملک کے تمام شہریوں کو پورے طور پر امن وامان، عدل وانصاف حاصل ہو، خصوصاً مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو کو جو خطرات لاحق ہوتے رہتے ہیں حکومت ان کا سدباب کرے، ملک میں ایسے حالات پیدا ہوں کہ انہیں انشورنس کے موجودہ نظام (جس میں ربوا، قمار وغیرہ کی شمولیت ہے) کا سہارا نہ لینا پڑے، یا مسلمانان ہند اور دوسرے باشندگان ملک اجتماعی کفالت کا ایسا نظام قائم کریں جو شرعی ممنوعات (ربوا، قمار وغیرہ) سے خالی ہو، اور اسلامی اور انسانی بنیادوں پر مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ انسانوں کی مدد واعانت کا کامیاب نظام قائم ہوسکے، یہ اس ملک کی بہت ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ اس کام کی راہیں کھولے، حکومت اور عوام کو اس کی توفیق دے۔

۱/اکتوبر ۲۰۲۲ء

عتیق احمد بستوی

(ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ)

●●●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

اللهم آتنی بفضلك أفضل ما توتی عبادك الصالحین

اس میں شک نہیں کہ تمام آسمانی مذاہب خیر کی ہی دعوت دیتے ہیں، اور ایک دوسرے کے تعاون پر اُبھارتے ہیں، لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس نے حق وانصاف اور خیر کی مدد کرنے کی تاکید کی ہے اور اس پر لوگوں کو آمادہ کرنے کی پرزور وکالت کی ہے، اس میں دنیا وآخرت کی بھلائی بتائی ہے، قرآن مجید میں ہے ﴿**وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان**﴾۔

اسلام نے صرف تعاون وتکافل پر آمادہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس کے سلسلہ میں واضح احکام دیے ہیں اور ہر قریبی شخص پر تعاون وتکافل کی ذمہ داری ڈال دی ہے تاکہ معاشرہ میں کوئی فرد بھی پریشان حال، مضطرب، بے یارومددگار نہ رہ جائے، قرآن وحدیث کے ذریعہ ہمارے سامنے پورا نظام پیش کردیا گیا ہے اگر ہم نفقات، کفالت، وراثت، جنایات، مؤالات، مواسات، عاقلہ وغیرہ کے نظام پر نظر ڈالیں تو ہمارے سامنے پورے اسلامی نظام کا سانچہ آجائے گا جو پورے معاشرہ کو ایسی آسودگی عطا کرتا ہے جس کے بعد کسی ایسے فرضی نظام کی ضرورت باقی نہیں بچتی ہے جو بظاہر معاشرہ کی فلاح کے لئے آواز بلند کرتا ہو لیکن باطن میں اپنی آسودگی کی فکر میں لگا رہتا ہے۔

آج کل سرمایہ دارانہ نظام میں تعاون انسانی کے نام پر انشورنس کی جو کمپنیاں قائم کی جارہی ہیں وہ نہ صرف نفع کے حصول کا ذریعہ ہیں بلکہ غریبوں کے استحصال کا باعث ہیں، ان کے سامنے نہ اصول ہیں نہ ضوابط، نہ حلال وحرام کی فکر ہے نہ کسی کی پریشانی پر اس

کی مدد کا جذبہ بلکہ صرف اپنے اور اپنے اہل وعیال کی فکر میں وہ ہر وقت مبتلا رہتے ہیں، استرباح کی خواہش نے ان کے اندر کے جذبہ تعاون کو دبا دیا ہے، سرمایہ دارانہ نظام صرف ایک طبقہ کو جو مالدار ہے مزید مالدار بنانے کی فکر میں لگا رہتا ہے، جب کہ اشتراکی نظام دولت کو اس طرح تقسیم کرنے کی فکر کرتا ہے کہ کوئی بھی شخص ایک حد سے دولت میں آگے نہ بڑھ سکے کسی کی بھی دولت کو وہ ضبط کرنے کے درپہ رہتا ہے اس کی محنت کی اس نظام کو پرواہ نہیں ہوتی ہے۔

جبکہ اسلام نے ہر شخص کو اس کی محنت کے اعتبار سے استحقاق کا حقدار بنایا ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی کردینے کے بعد وہ اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی تمام دولت کا حقدار رہے گا۔

یہ وہ راستہ ہے جو میانہ روی کی طرف لے جاتا ہے اور اس سے معاشرہ خوشحال ہوتا چلا جاتا ہے۔

دوسرے نظاموں کا جہاں تک تعلق ہے تو اس سے معاشرہ میں بے راہ روی پھیلتی ہے، آپس میں تعاون کا جذبہ ختم ہوجاتا ہے، ایک دوسرے کی نفرت دلوں کے اندر پیدا ہونے لگتی ہے جو آگے چل کر طوائف الملوکی کی باعث بن جاتی ہے۔

انشورنس کا موجودہ نظام بھی انہی دو طبقوں کا پیدا کردہ ہے جس میں یا تو سرمایہ دار طبقہ کا استحصال پایا جاتا ہے، یا متوسط وغریب طبقہ کو دبایا جاتا ہے اور چونکہ یہ دونوں طبقے مذہب سے دور ہیں، اس لئے ان کے سامنے ظاہری آسودگی ہی اہمیت کا درجہ رکھتی ہے، حلال وحرام، نفع ونقصان، کسی فرد کو نفع پہونچانا اور اس کے لئے دوسرے کو نقصان پہونچانا اہمیت کا باعث نہیں ہے، لیکن اسلامی نظام میں اس کی بڑی اہمیت آئی ہے نہ کسی دوسرے کو نقصان پہونچانا ہے اور نہ اپنے آپ کو نقصان پہونچانا، ہر ایک کے لئے نفع کا باعث بننا ہے۔ قاعدہ فقہیہ ''لاضرر ولا ضرار'' اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

اور قرآن مجید کا یہ حکم بھی انہی باتوں کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے بلکہ ہر ایک کی فکر کو

ضروری قرار دیتا ہے:

﴿ولیخش الذین لو ترکوا من خلفھم ذرّیۃ ضعافا خافوا علیھم فلیتقوا اللہ ولیقولوا قولاً سدیداً﴾

حدیث میں ہے:

''واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون أخیہ''

''أن تذر ورثتك أغنیاء خیر لك من أن تذرھم عالة یتکفون الناس''

ان تمام نصوص کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اپنی اور اپنی اولاد کی اور اپنے معاشرہ کے تعاون کی فکر کرنا ہر فرد بشر کی ذمہ داری ہے، لیکن اس ذمہ داری کو نبھانے کے شریعت نے جو قاعدے وضابطے بنائے ہیں ان کو سامنے رکھ کر ہی ہمیں آگے بڑھنا ہوگا۔

اس لئے کہ شریعت نے کوئی بھی ایسا جزء نہیں چھوڑا ہے جس میں کسی انسان کی حاجت روی کی فکر نہ کی گئی ہو، شریعت نے ہر چیز کے ضابطے وقاعدے مقرر کردیئے ہیں، شریعت کا ہر جزئیہ ہمیں صحیح رخ اختیار کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے، اس پر غور وفکر کرکے ہم صحیح راہ اختیار کرسکتے ہیں، ہاں ضرورت کے وقت ہمیں بہت سی ممنوع چیزوں میں گنجائش دی گئی ہے لیکن ضرورت کو سمجھنا بھی ایک اہم مسئلہ ہے، اور اس کی رہنمائی ہمیں قرآن وحدیث اور اجماع امت سے مل جاتی ہے، کوئی گوشہ اسلام میں تشنہ نہیں ہے، لیکن آج یہ دعوی کرنا کہ انشورنس نیا نظام ہے اور اس کی نظیر پہلے نہیں ملتی صحیح نہیں، اسلام میں فقراء کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے متعدد نظام ملتے ہیں جس میں نہ سود ہے نہ غرر اور نہ قمار، جیسے کفالت، ولایت، عاقلہ وغیرہ کا نظام اس سے نہ صرف یہ کہ فقراء کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں بلکہ یہ طریقے قضاء وقدر سے مقاومت کے دائرہ میں بھی نہیں آتے ہیں، پھر یہ کہ اسلام میں زکوٰۃ کا جو نظام ہے اگر اسے پورے طور پر روبہ عمل لایا جائے تو اس سے بڑی حد تک فقراء کی ضرورتیں پوری ہوجائیں گیں۔

اب یہ دعوی کرنا کہ اسلام میں اجتماعی کفالت کا کوئی نظام نہیں ہے، کفالت، ولایت، عاقلہ، مواساۃ، مؤاخاۃ وغیرہ نظاموں کو دیکھنے کے بعد یہ دعوی باطل ہوجاتا ہے، اورانشورنس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ خالص غریبوں کے مفاد میں ہے یہ دعوی صحیح نہیں ہے، انشورنس کا پورا کا پورا نظام نفع خوری اور نئے طریقے سے غریبوں کے مال کر ہڑپنے کے لئے وضع کیا گیا ہے، اس کے جو ضابطے ہیں وہ صریح طور پر ظلم پر مبنی ہیں چند لوگ اس سے مستفید تو ہوسکتے ہیں لیکن اکثریت اس نظام کی وجہ سے اپنا کل کا کل سرمایہ گنوا بیٹھتی ہے، یہ نظام خالص سود، قمار، غرر پر مبنی ہے، جن کی ممانعت صریح نصوص میں موجود ہے اس لئے عام حالات میں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

۱۶/ویں صدی عیسوی تک مروجہ انشورنس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے، سترھویں صدی کے وسط میں ۱۶۶۶ء میں لندن میں آگ لگنے کے بعد اس کا وجود ہوا، اور پھر بحری نقصان کے بعد اس کی ابتداء ہوگئی، علامہ شامی کے یہاں سوکرہ کے نام سے اس کا ذکر ملتا ہے، بظاہر نقصان کی بھرپائی کے لئے تعاون کے جذبہ سے اس کا چلن ہوا لیکن آہستہ آہستہ مادیت اس پر غالب آگئی اور ایسے طریقے اس میں داخل ہوگئے جو صریح نصوص کے خلاف تھے، جس نے مضرت کے پہلو کو منفعت کے پہلو پر غالب کردیا اور اس طرح یہ غریبوں اور متوسط طبقہ کا استحصال کا باعث بن گیا۔

اس سلسلہ میں (انشورنس کے جواز وعدم جواز کے مسئلہ کو لے کر) بڑی بڑی کانفرنسوں کا انعقاد ہوا اور علماء کے اس سلسلہ میں ہمیشہ دو طبقہ رہے ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن حسنی ندویؒ کی سرپرستی میں تحقیقات شرعیہ کا ۱۹۶۳ء میں قیام عمل میں آیا تاکہ جدید پیش آمدہ مسائل کا علماء جائزہ لیں اور کوئی لائحہ عمل طے کریں، اس سلسلہ میں تحقیقات شرعیہ کے تحت ۱۹۶۵ء میں انشورنس پر کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ ہوا، جس کیلئے ایک سوالنامہ تحقیقات شرعیہ کے کنوینر حضرت مولانا اسحاق سندیلویؒ نے فرمایا اور اصحاب تحقیق علماء وفقہاء کو یہ سوالنامہ بھیجا گیا اور اس کو سامنے رکھ کر ان سے ان کی

آراء طلب کی گئیں، اس سوالنامہ پر کچھ حضرات کے بڑے تفصیلی مقالات اور بعض حضرات کی واضح آراء سامنے آئیں۔

انشورنس سے متعلق سوالنامے کے جواب میں جن اکابر علماء وفقہاء کی مفصل یا مختصر تحریریں موصول ہوئیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں، ان سب کی تحریریں اور فتاویٰ اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

مفتی شفیع صاحبؒ، مفتی ولی حسن ٹونکی صاحبؒ، مولانا یوسف بنوری صاحب، مفتی محمود حسن صاحبؒ، مولانا سید مہدی حسنؒ، محمد ہارون بلوچستانی صاحبؒ، محمد یحییٰ قاسمی صاحبؒ، مفتی ظفیر الدین صاحب، مولانا مظفر حسین مظاہریؒ صاحب، مولانا عبید اللہ مبارکپوری صاحبؒ، مولانا سید عروج قادری صاحبؒ، مولانا عبد السلام ندوی صاحبؒ، مولانا محمد میاں صاحبؒ، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا عبد الماجد دریابادی صاحبؒ، پروفیسر عبد الوہاب صاحب، مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمٰن خیرآبادیؒ صاحب۔

انشورنس کے موضوع پر غور اور فیصلہ کے لئے ۱۵، ۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو مجلس تحقیقات شرعیہ کا اجلاس بلایا گیا، آئی ہوئی تحریروں اور فتاوی کی روشنی میں اور موضوع پر تبادلۂ خیالات کے بعد مجلس نے درج ذیل تجویز مرتب کی۔

''مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے ''ربوٰ وقمار'' لازم ہے اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب ہے لیکن جان ومال کے تحفظ وبقا کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے، مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے، نیز مجلس اس صورتِ حال سے بھی صرفِ نظر نہیں کرسکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی ریاستوں سے انشورنس انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہوگیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جان ومال کے تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے ضرورت

شدیدہ کے پیشِ نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائیداد کا بیمہ کرائے.....تو شرعاً اس کی گنجائش ہے۔''(۱)

یہ فیصلہ ۱۹۶۵ء کا ہے.....اس کے بعد بھی ہندوستان کے موجودہ حالات کی روشنی میں تحفظ کے نقطۂ نظر سے یا قانونی مجبوری کے تحت عام طور پر علماء وارباب افتاء اس کے جواز کے فتویٰ دیتے رہے ہیں، انہیں اہلِ علم میں مفتی محمود حسن گنگوہی، مفتی عبدالرحیم لاجپوری اور مفتی نظام الدین صاحب (سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) بھی ہیں۔(۲)

مجلس تحقیقات شرعیہ جس طرح سرگرم عمل ہوئی تھی اس سے ایسی امید پیدا ہوگئی تھی کہ یہ سلسلہ دراز ہوگا اور پیچیدہ مسائل کا حل انشاء اللہ نکلتا رہے گا، جس اخلاص کے ساتھ اس کو شروع کیا گیا تھا کوئی وجہ نہیں تھی کہ یہ سلسلہ رکتا، لیکن بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا اور چونکہ اس کی بنیاد میں اخلاص تھا اس لئے اس سلسلہ اسلامک فقہ اکیڈمی اور مباحث فقہیہ نے آگے قدم بڑھایا، اس سلسلہ کے مقالات بڑی حفاظت سے مجلس تحقیقات شرعیہ کے آفس میں محفوظ تھے، جب مولانا عتیق احمد بستوی مدظلہ العالی کو تحقیقات شرعیہ کی ذمہ داری دی گئی تو مولانا نے نئے سرے سے مجلس کو منظّم کرنے کی فکر کی اور اس کے لیے متعدد میٹنگیں وغیرہ رکھی اور جو مقالات مختلف موضوعات کے آئے تھے ان کو جمع کروا کر اس کی تبیض وتحقیق کا کام مختلف لوگوں کے حوالہ کیا جس میں راقم کے ذمہ انشورنس کے مقالوں کی ذمہ داری ڈالی گئی، راقم مولانا کا شکرگزار ہے کہ ایک علمی کام کے کرنے کا موقع عنایت کیا، اللہ رب العزت اس کا بہترین صلہ مولانا کو عطا فرمائے، راقم ان تمام لوگوں کا مشکور ہے جنہوں نے اس مقالہ کی تیاری کے سلسلہ میں تعاون کیا ہے جس میں خاص طور پر برادرم عبدالحی حسنی اور عزیزی عبدالمحیط جونپوری کا

(۱) اس تجویز پر مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا فخر الحسن صاحب دیوبندی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا محمد اویس ندوی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی رحمہم اللہ تعالیٰ، مولانا محمد منظور نعمانی، مفتی محمد ظفیر الدین، شاہ عون احمد قادری اور مولانا محمد اسحاق سندیلوی کے دستخط ہیں۔

(۲) ملاحظہ ہو: فتاوی محمودیہ ۴/۲۴۰، فتاوی رحیمیہ ۶/۱۳۲، منتخب نظام الفتاوی ۲/۲۵۱۔

جنہوں نے پروف ریڈنگ اور حوالوں کی تخریج میں تعاون کیا کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب راقم کے مشفق ومربی بڑے بھائی جناب مولانا محمود حسن حسنی کی بیماری کی وجہ سے راقم پوری طرح سے اس کام میں لگ نہیں پا رہا تھا، پھر ان کے انتقال کی وجہ سے ذہن ودماغ پر بڑا اثر پڑا، راقم ان کے لئے دعاؤں کا خاص طور پر طالب ہے۔

اور برادر عزیز جناب مولانا منور سلطان صاحب اور جناب مولانا عطاء الرحمٰن صاحب اور جناب مولانا نصر اللہ صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، جنہوں نے گاہے گاہے اس مقالہ کی تیاری میں تعاون کیا۔

اخیر میں ہم اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ اس پورے سلسلہ کو قوت فراہم کرنے والے ہمارے مرشد ومربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے سایہ عاطفت کو تادیر قائم ودائم رکھے اور مجلس کو اللہ رب العزت مفید سے مفید تر بنائے اور جو لوگ اس دنیا سے جا چکے ہیں رب العالمین ان کے حسنات کو قبول فرمائیں اور سیئات سے درگزر فرمائیں۔

۲۶/ستمبر ۲۰۲۲ء

مسعود حسن حسنی ندوی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

●●●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم المقام زیدت فیوضکم السلام علیکم ورحمة الله

''سوالنامہ متعلق بیمہ پالیسی'' جن حضرات کی خدمت میں بغرض جواب ارسال کیا گیا تھا ان سب کے جوابات تو ہنوز نہیں آئے ہیں مگر خاصی تعداد ایسے حضرات کی ہے جن کا جواب موصول ہو رہا ہے، جوابات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی پڑ چکی ہے، اور حضرات مجیبین کی تعداد بھی معتد بہ ہے، مزید جوابات کے استفسار میں مزید تاخیر کرنا بے سود معلوم ہوتا ہے، اور مناسب یہی نظر آتا ہے کہ حضرات ارکان مجلس ان جوابات کی روشنی میں مسئلہ پر غور فرما کر کوئی فیصلہ صادر فرما دیں۔

ظاہر ہے کہ مسئلہ کی اہمیت اس بات کی مقتضی ہے کہ حضرات موصوف اس پر خوب غور وخوض فرما کر فیصلہ فرمائیں، اس لئے احقر کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ ارکان مجلس کو اب جوابات بغرض غور وخوض جلسہ طلب کرنے سے پہلے ارسال کئے جائیں اور غور وتامل کے لئے مناسب وقت دیا جائے۔ بنابریں سب جوابات سائیکلواسٹائل پر طبع کرا کے آپ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ صدر اور بعض حضرات ارکان مجلس حج وزیارت کے لئے گئے ہوئے ہیں انکی واپسی پر انشاءاللہ مجلس کا جلسہ طلب کیا جائے گا۔ والسلام

احقر

محمد اسحاق

●●●

مسئلہ بیمہ: تاریخ وتعارف

بیمہ کی تعریف

بیمہ: بیمہ دار اور کمپنی کے درمیان ایک قسم کا معاہدہ ہے جو مستقبل کے امکانی وناگہانی حادثات وخطرات میں حصول استطاعت کے لئے کمپنی کی مقرر کردہ شرطوں کے مطابق انجام پاتا ہے۔

اس معاہدہ کے مطابق بیمہ دار معینہ رقم کمپنی کو ادا کرتا ہے اور کمپنی مالی کفالت کا ذمہ لیتی ہے۔ کفالت کی مقدار ایک خاص نظم کے تحت ادا کی ہوئی رقم سے کچھ زیادہ ہوتی ہے اور زیادتی کو بونس (منافع) کا نام دیا جاتا ہے۔

بیمہ کا فائدہ بیمہ دار کو اور فوت ہو جانے پر اس کے ورثاء یا نامزد کردہ شخص کو پہنچتا ہے۔

بیمہ کی ابتدائی تاریخ

اس کی ابتداء باہمی تعاون وہمدردی کے جذبہ سے اس طرح ہوئی کہ تاجروں کا مال طوفان کی وجہ سے اکثر سمندر میں ضائع ہو جاتا تھا اور نقصان کے تلافی کی کوئی صورت نہ ہونے کی وجہ سے تاجر انتہائی درجہ پریشان ہو جاتے اور مفلوک الحال بن جاتے تھے۔

اس حالت سے مجبور ہو کر باہمی مشورہ سے یہ حل نکالا گیا کہ جس شخص کا مال سمندر میں طوفان کی نذر ہو جائے اس کو تمام تاجر مل کر ہر ماہ یا ہر سال ایک معینہ رقم بطور امداد دیا کریں تاکہ کسی حد تک نقصان کی تلافی کا بندوبست ہو سکے۔ امداد باہمی کی یہی شکل آگے چل کر جہازوں کے بیمہ تک پہونچی اور مزید ترقی ہوئی تو ملاحوں کی جان کا بیمہ ہونے لگا۔

بیمہ کی اس ابتدائی شکل کا ثبوت چودھویں صدی عیسوی کی اٹلی میں ملتا ہے پھر اس کے بعد ہالینڈ میں جہاز کے مالکوں بحری تاجروں، صناعوں اور زراعت پیشہ لوگوں (جن

کے مفاد جہازوں کی تباہی سے متاثر ہوتے تھے نے ملکر بیمہ کے اس سسٹم کو رواج دیا جس کو اصطلاحا بیمہ کہا جاتا ہے)۔

بیمہ کو منظّم شکل دینے کے لئے سب سے پہلے ۱۴۳۵ء میں ضابطۂ قوانین ''آرڈیننس برسلونہ'' کے نام سے ترتیب دیا گیا پھر اس میں جس قدر ترقی ہوتی گئی اسی لحاظ سے قوانین وضع کئے جاتے رہے۔

بیمہ زندگی (۱) کا آغاز انگلستان میں ہوا ہے، ابتداءاً صرف متوفی (جبکہ نادار ہو) کی تجہیز وتکفین کا بندوبست کیا جاتا تھا پھر بعد میں بیمہ کے ذریعہ بیوہ اور یتیموں کے کفالت کی راہیں نکالی گئیں۔

وفات کے بعد قرض کی ادائیگی کے لئے ایک مختصر بیمہ کا ثبوت ۱۵۸۳ء میں ملتا ہے۔لیکن باقاعدہ اور منظّم شکل میں بیمہ کی ابتداء انگلینڈ اور اسکاٹ لین میں ہوئی ہے اور ۱۸۷۰ء میں لائف انشورنس ایکٹ کے ذریعہ بیمہ داروں کے مفادات کے تحفظ کا اہتمام کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں نہ بیمہ کا تدریجی ارتقاء بیان کرنا مقصود ہے اور نہ ابتدائی قسموں کی تشریح وتوضیح سے بحث ہے بلکہ موقع کے لحاظ سے اصولی حیثیت سے گفتگو کر کے صرف اس کی اصلی نوعیت کو واضح کر دینا ہے۔

بیمہ کی نوعیت

بیمہ کی حقیقت اور ابتدائی شکلوں میں غور وفکر سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی اصلی ساخت میں پس اندازی کے فطری رجحان کو دخل ہے جس کا اہم مقصد اثاثہ جمع کر کے مستقبل کے غیر متوقع حادثات وخطرات کا مقابلہ کرنا ہے۔

انسان اس رجحان کو بروئے کار لانے کے لئے اضطراری واختیاری مختلف انداز کی تدبیریں کرتا رہتا ہے، بیمہ بھی اپنی ترتیب وتنظیم کے لحاظ سے خاص انداز کی ایک تدبیر ہے۔

(۱) لائف انشورنش۔

بیمہ کی قسمیں

بیمہ کی بنیادی حیثیت سے دو قسمیں ہیں (۱) اموال کا بیمہ اور (۲) زندگی کا بیمہ، لیکن بالعموم اس کی اس طرح تقسیم کی جاتی ہے۔

(۱) بحری بیمہ: یہ بحری خطرات سے امکانی نقصان کی تلافی کے لئے ہوتا ہے، مال کا خریدار بیمہ کی رقم ادا کرتا ہے اور بیچنے والا بیمہ کرا کے مال روانہ کرتا ہے۔

(۲) آگ کا بیمہ: آگ کے امکانی خطرات سے نقصان کی تلافی کے لئے معینہ رقم کے ذریعہ کرایا جاتا ہے۔

(۳) حادثاتی بیمہ: مستقبل کے امکانی حادثہ اور نقصان کی تلافی کے لئے ہوتا ہے۔اس کی تین صورتیں ہیں۔

(الف) شخصی بیمہ (پرسنل اکسیڈنٹ): اس میں اعضاء انسانی ہاتھ پاؤں ناک کان وغیرہ کا بیمہ ہوتا ہے۔

اس کا رواج عام طور پر یورپ وغیرہ میں ہے، ہندوستان میں نہیں ہے۔

(ب) جائداد کا بیمہ (پراپرٹی اکسیڈنٹ): اس میں اموال زمین مکان موٹر وغیرہ کا بیمہ ہوتا ہے۔

اموال کا بیمہ ایک ایک سال کے لئے ہوتا ہے اور رقم سال بسال ادا کرنی پڑتی ہے۔

(ج) ذمہ داری کا بیمہ (مسئولیات یا لائبلیٹی اکسیڈنٹ): اس میں بچہ کی تعلیم، شادی وغیرہ کا بیمہ ہوتا ہے۔

(۴) زندگی کا بیمہ: ضعیفی بیماری اور موت کی وجہ سے نقصان کی تلافی کے لئے ہوتا ہے۔

زندگی کا بیمہ

بیمہ زندگی میں پہلے ڈاکٹری معاینہ کے ذریعہ بیمہ کرانے والے کی صحت، تندرستی

اورعمر طبعی وغیرہ کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔اس معاینہ کے بعد کمپنی سے مقررہ رقم پر متعینہ مدت کے لئے ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کے مطابق بیمہ کرانے والے کو ماہوار، سہ ماہی، ششماہی یا سالانہ (جیسا طے ہوا) قسط وار وہ رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔

مدت ختم ہونے کے بعد کمپنی اتنی ہی رقم (جتنی جمع کی گئی ہے) اور کچھ زائد بیمہ کرانے والے کے حوالہ کرتی ہے، اس زائد رقم کو کمپنی منافع یا بونس کا نام دیتی ہے۔

صورت یہ ہوتی ہے کہ ہر سال یا ہنگامی حالات میں کئی کئی سال کے بعد قسطوں کی ادائیگی کے زمانہ میں اس کا دیا جانا منظور کیا جاتا ہے اور بیمہ کرانے والے کے پاس صرف اطلاعی تحریر بھیج دی جاتی ہے کہ اس سال فلاں شرح سے منافع دیا جانا طے پایا ہے۔

یہ شرح ۱ ۳/۴ فیصد حاصل شدہ منافع سے زیادہ نہیں ہوتی ہے اور اصل کے ساتھ بونس کی رقم جمع ہوتی رہتی ہے درمیان میں اس کی ادائیگی کی کوئی صورت نہیں ہوتی ہے۔

●●●

بیمہ زندگی کے دو شعبے ہیں
(۱) صنعتی اور (۲) عمومی

صنعتی میں بیمہ کا چندہ (پریمیم) کم مقدار میں ہفتہ وار یا ماہانہ قسطوں کے ذریعہ لیا جاتا ہے تاکہ مزدور طبقہ بآسانی ادا کرتا رہے۔لیکن عمومی چندہ بالاقساط سہ ماہی، ششماہی یا سالانہ لیا جاتا ہے، یہی صورت زیادہ رائج ہے۔

لائف انشورنس کارپوریشن

بیمہ زندگی کی چھوٹی بڑی کمپنیاں نئے قانون کے ماتحت ختم کردی گئی ہیں اور ان کی جگہ لائف انشورنس کارپوریشن کا نظام قائم ہوگیا ہے۔اس کارپوریشن میں بڑی کمپنیوں کے بھی کچھ حصہ ہیں لیکن اب نہ ان کی انفرادی حیثیت باقی ہے اور نہ وہ من مانی کارروائی کرنے کی مجاز ہیں بلکہ نیشنلائز ہوکر حکومت کے باقاعدہ تصرف میں آ گئی ہیں۔مثلاً یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ کارپوریشن کا چیف ڈائرکٹر (افسر اعلی) حکومت کا نامزد کردہ شخص ہوگا، نیز کارپوریشن اپنی آمدنی کا ساٹھ فیصد حصہ حکومت کے قرضہ جات میں لگانے پر مجبور ہوگی۔

ابتداء میں یہ قانون لائف انشورنس کمپنیوں تک محدود تھا، بیمہ اموال وحادثات وغیرہ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن رفتہ رفتہ اس میں وسعت ہوتی جارہی ہے اور اندازہ ہے کہ مستقبل قریب میں ہر قسم کی بیمہ کمپنیوں کو نیشنلائز کرلیا جائے گا۔

بیمہ کی مزید وضاحت

مزید وضاحت کے لئے چند اور باتیں ذہن نشین کرلینا ضروری ہے۔

(۱) کمپنی یا کارپوریشن بیمہ سے وصول شدہ رقم کو قرضہ جات یا کاروبار میں لگاتی ہے اور جو سود یا منافع ملتا ہے اس میں سے مذکورہ زائد رقم (بونس) ادا کی جاتی ہے۔ اسی طرح کمپنی کے پاس ایک معتد بہ رقم ایسے بیموں کی رہتی ہے جو بیمہ کرانے والے ایک دو قسطیں دینے کے بعد ادائیگی بند کر دیتے ہیں اور قانوناً ان کا بیمہ سوخت ہو جاتا ہے۔

(۲) اموال کے برخلاف زندگی کا بیمہ کئی متعینہ سال کے لئے ہوتا ہے اور رقم قسط وار ادا کرنی پڑتی ہے۔

(۳) چند ماہ قسط کی ادائیگی کے بعد اگر بیمہ وار قسط دینا بند کر دے تو اس کی ادا شدہ رقم فوت ہو جاتی ہے البتہ دو سال تک برابر ادا کرتے رہنے سے یہ رقم بیمہ کی مدت پوری ہونے کے بعد مل جاتی ہے۔

(۴) قسط بند کر دینے کی صورت میں بیمہ دار جب چاہے حسب سابق قسط جاری کر سکتا ہے، درمیان کی بقایا اقساط ہو سکے تو یکمشت ادا کر دے ورنہ جتنے کے اقساط باقی ہیں مدت کے آخر میں اس کا اضافہ ہو جائے گا۔

(۵) بیمہ دار کو منافع (سود) کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا ہے یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔

(۶) غیر منافع والے بیمہ میں پہلے ہی سے اس کی وضاحت ہوتی ہے اور اقساط کی رقم میں نسبتہً کمی ہوتی ہے۔

(۷) بیمہ دار دو سال تک قسط ادا کرتے رہنے کے بعد کم منافع (سود) پر کمپنی سے قرض لینے کا مجاز ہو جاتا ہے۔

(۸) مدت مقررہ سے پہلے بیمہ دار کو موت آ جائے تو اگرچہ پوری رقم اپنی نہیں ادا ہوئی ہے پھر بھی کمپنی معاہدہ کے مطابق پوری طے شدہ رقم ادا کرتی ہے۔

(۹) مدت مقررہ تک بیمہ دار زندہ رہتا ہے تو وہ خود زر بیمہ وصول کرتا ہے ورنہ اس کے بعد ورثاء مستحق ہوتے ہیں اور اگر بیمہ دار نے کسی غیر کو نامزد کیا ہے تو پھر وہ حقدار ہوتا ہے۔

(۱۰) یہ نامزد کردہ شخص یا اشخاص بیمہ دار کے ورثاء ہوں یا غیر ہوں کمپنی کو اس

سے بحث نہیں ہے، کمپنی نامزدگی ہی کی پابندی کرے گی۔

بیمہ کے سلسلہ میں علماء کا شرعی نقطہ نظر

بیمہ کی مذکورہ تشریح وتوضیح کے بعد قدیم وجدید علماء کے خیالات کا ذکر کیا جاتا ہے جو انہوں نے شرعی نقطۂ نظر سے پیش کئے ہیں۔

علامہ شامی نے بحری بیمہ کا ذکر اس انداز سے کیا ہے۔

"انه جرت العادة ان التجار اذا استاجروا مركبا من حربي يدفعون له اجرته ويدفعون ايضا مالا معلوماً لرجل حربي مقيم في بلاده يسمى ذلك المال "سوكره" على انه مهما هلك من المال الذي في المركب بحرق او غرق او نهب او غيره فذلك الرجل ضامن له بمقابلة ما ياخذه منهم وله وكيل عنه مستامن في دارنا يقيم في بلاد السواحل الاسلامية باذن السلطان يقبض من التجار مال السوكره واذا هلك من مالهم في البحر شيئ يودي ذلك المستامن للتجار بدله". (۱)

''تاجروں کی یہ عادت ہے کہ جب وہ مال تجارت کے لئے مال بردار جہاز کو کرایہ پر لیتے ہیں تو کرایہ کے علاوہ معینہ رقم پر ایک اور شخص سے مال پہونچانے کا معاملہ کرتے ہیں یہ رقم ''سوکرہ'' کہلاتی ہے اور یہ شخص (صاحب سوکرہ) دارالحرب کا باشندہ ہوتا ہے جو حکومت کی اجازت سے دارالاسلام کے سرحدی مقامات پر اسی کام کے لئے ٹھہرا رہتا ہے۔ یہ شخص معینہ رقم کے ذریعہ تاجر کا

(۱) ردالمحتار کتاب الجہاد باب المستامن ۲/ ۳۴۵۔

وکیل اور مال پہونچانے کا ذمہ دار بن جاتا ہے اور اگر اتفاقا مال
تلف ہوجائے (ڈوب جائے جل جائے یا لوٹ لیا جائے وغیرہ)
تو یہی شخص اس رقم کے عوض مال کا تاوان ادا کرتا ہے''۔

علامہ شامی کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ دارالحرب ودارالاسلام کے درمیان بحری بیمہ کی ضرورت ہوتی تھی، چنانچہ دارالحرب میں وہ اس معاملہ کو جائز کہتے ہیں اور دارالاسلام میں ناجائز بتاتے ہیں، اسی طرح اگر ایک شریک دارالحرب میں ہو اور دوسرا دارالاسلام میں رہتا ہے لیکن ''سوکرہ'' کا معاملہ حربی شریک طے کرتا ہے اور مال تلف ہونے کی صورت میں وہی بدل وصول کرکے دارالاسلام میں روانہ کرتا ہے تو یہ بھی صورت جائز ہے۔

''قد یکون للتاجر شریک حربی فی بلاد الحرب فیعقد شریکه هذا العقد مع صاحب السوکرة فی بلادهم ویاخذ منه بدل الهالک ویرسله الی التاجر فالظاهر ان هذا یحل للتاجر اخذه''. (۱)

''کبھی تاجر کا حربی شریک دارالحرب میں رہتا ہے اور وہی صاحب سوکرہ سے معاملہ کرتا ہے اور مال تلف ہونے کی صورت میں اس کا بدل وصول کرکے تاجر کو روانہ کرتا ہے تو تاجر کو یہ بدل لینا حلال ہے''۔

دارالاسلام میں بحری بیمہ کے لئے عام حکم یہ ہے۔

''والذی یظهر لی انه لا یحل للتاجر اخذ بدل الهالک من ماله لان هذا التزام ما لا یلزم''. (۲)

''جو بات مجھ پر واضح ہوئی وہ یہ ہے کہ صاحب سوکرہ سے تلف ہونے والے مال کا بدل وصول کرنا تاجر کے لئے حلال نہیں ہے

(۱) ایضا (ردالمحتار کتاب الجہاد باب المستامن ۶/۲۸۰۔
(۲) ایضا (ردالمحتار کتاب الجہاد باب المستامن ۶/۲۸۱۔

کیونکہ یہ ایک ایسی شئ کا التزام ہے جو لازم نہیں ہے''۔

موجودہ دور میں قدیم انداز بحث مناسب نہیں ہے، یہاں صرف یہ طے کرنا کہ ہے موجودہ دور کے نئے مسائل حل کرنے کے لئے دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث مفید ہوسکتی ہے؟ اور کیا کسی اسٹیٹ کا کلمہ پڑھ لینا اس فیصلہ کے لئے کافی ہے؟

جب قوم موت وحیات کی کشمکش میں مبتلاء ہو خود کی توانائیاں بقاء کی جدوجہد میں جواب دے رہی ہوں اور نئے حالات نے زندگی کا نیا نقشہ مرتب کردیا ہو تو کہاں تک دارالحرب ودارالاسلام کی بحث مفید ہوسکتی ہے اور عملی زندگی میں اس کا جو اثر مرتب ہوگا وہ کس حد تک قابو میں رہ سکے گا؟ اگر دارالحرب کو بنیاد بنا کر کسی ایک مسئلہ میں بھی جواز کا فیصلہ کرلیا گیا تو تمام عقود فاسدہ میں اسکا لحاظ ضروری ہوگا اور پھر مذہبی اقدار کا تحفظ مشکل ہوجائے گا، جیسا کہ علامہ شامی کی درج ذیل وضاحت سے اس بحث کے دوررس اثرات پر روشنی پڑتی ہے۔

''بخلاف المستامن منهم فی دارنا لان دارنا محل اجراء الاحکام الشرعیة فلا یحل لمسلم فی دارنا ان یعقد مع المستامن الا ما یحل من العقود مع المسلمین''. (۱)

''اور جو حربی حکومت کی اجازت حاصل کرکے دارالاسلام میں رہتا ہو اس سے شریعت کے خلاف کوئی معاملہ جائز نہیں ہے کیونکہ دارالاسلام احکام شرعیہ کے نفاذ کا محل ہے یہاں کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ مستامن کے ساتھ خلاف شریعت کوئی معاملہ کرے۔ حربیوں کے ساتھ بس وہی معاملات جائز ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ جائز ہیں''۔

(۱) ایضاً ۶/۲۸۰۔

"بخلاف المسلم المستامن فی دار الحرب فإن له أخذ ما لهم برضاتهم ولو بربا أو قمار إلا أن الغدر حرام" (۱)

"جومسلمان دارالحرب میں رہ رہا ہواس کوحربیوں کا مال ان کی رضامندی سے لینا حلال ہے اگر چہ یہ سود یا جوا سے لیا جائے، البتہ غداری وبے وفائی حرام ہے۔"

چونکہ مسلم ممالک میں بیمہ کا عام رواج تیرہویں صدی ہجری میں ہوا ہے اور کتب فقہ کی ترتیب وتدوین بہت پہلے ہوچکی تھی اس بناء پر قدیم ذخیرہ میں کوئی تفصیلی اور اصولی گفتگونہیں ملتی ہے، البتہ رواج پانے کے بعد علماء نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۳۲۴ھ میں مصر کے مفتی کا فتویٰ:۔

۱۳۲۴ھ م ۱۹۰۶ء (عہدعثمانی) میں مصر کے مشہور حنفی مفتی شیخ محمد نجیب المطیعی نے بیمہ کے عدم جواز کا فتوی دیا اور اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا جس کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔

"ان ضمان الاموال شرعا يكون بأحد طريقين إما بطريق الكفالة وإما بطريق التعدى او الاتلاف وان عقد السكورتاه (التامين) لا تنطبق عليه شرائط الكفالة كما ان هلاك المال المؤمن عليه لا يكون بتعد من شركة التامين فلا مجال لايجاب الضمان عليها اذا هلك المال المؤمن عليه لعدم توافر اسباب الضمان شرعا".

"شرعی حیثیت سے اموال کا ضمان دوطرح سے لازم آتا ہے (۱) کفالت کے طریقہ سے اور (۲) مال کی ہلاکت میں کسی کی طرف سے تعدی پائی جانے کی صورت میں۔ بیمہ کے عقد میں

(۱) ایضاً ۶/۲۸۰۔

کفالت کی شرطیں نہیں پائی جاتی ہیں کیونکہ جس مال کا بیمہ کرایا گیا ہے اس کی ہلاکت میں بیمہ کمپنی کو کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔ چونکہ ضمان کے اسباب نہیں پائے جاتے ہیں اس لئے وجوب ضمان کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے"۔

پھر اس کے بعد شیخ صاحب نے عقد بیمہ کو فاسد قرار دیتے ہوئے فساد کی وہی دلیل (التزام مالا یلزم) دی ہے جو علامہ شامی نے بیان کی ہے۔ اور دارالحرب ودارالاسلام کی بحث کو بنیاد قرار دے کر دارالحرب میں بیمہ کو جائز قرار دیا ہے اور دارالاسلام میں ناجائز بتایا ہے۔

علامہ موسی جاراللہ کی رائے

پھر ۱۳۶۳ھ م ۱۹۴۳ء میں اس رائے کے خلاف علامہ موسی جاراللہ نے بیمہ کے جواز بلکہ مستحسن ہونے پر مفصل گفتگو کی ہے، اور اس مضمون پر مستقل رسالہ لکھا جس کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔

بیمہ کے جواز کی تین بنیادیں ہیں۔

(۱) دوسروں کی خیرخواہی (نصیحت)

(۲) حقوق کی نگہبانی (رعایت)

جیسا کہ حدیث میں ہے۔"كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته" (۱)

(ہر شخص راعی ہے اور قیامت کے دن اس کی رعایا کے متعلق باز پرس ہوگی۔ جس طرح ہر شخص پر دوسرے کی خیرخواہی واجب ہے اسی طرح ہر ایک پر حقوق کی حفاظت ونگہبانی ضروری ہے۔

(۳) ذامہ داری وضمانت لینا (کفالت)

(۱) بخاری شریف، کتاب فی الاستقراض، رقم الحدیث ۲۴۰۹۔

کفالت کی دوصورتیں ہیں۔

(۱) خاص۔اس میں ایک شخص دوسرے کا کفیل ہوتا ہے۔

(۲) عام۔اس میں معاشرہ کا ہر فرد دوسرے کی اصلاح ونفع رسانی کا کفیل ہوتا ہے۔

معاشرتی کفالت کا اعتبار دنیا کے ہر قانون نے ہر دور میں کیا ہے حتی کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی اس کفالت کا انتظام تھا اور اسلام نے نہایت اونچے پیمانہ پر اس کو رواج دینے کی کوشش کی ہے۔

بیمہ کی ان بنیادوں کو واضح کرنے کے بعد علامہؒ کہتے ہیں۔

"ان الاشتراک فی الشرکة اختیاری وضمان الخسار عند وقوع الاخطار من المجموع المشترک تعاون وتکافل ولیس الضمان بربح للمبالغ المدفوعة والشرکة اذا استعملت واستخدمت المال المجموع فی امور نافعة او فی التجارة فالتجارة مضاربة والارباح ارباح مضاربة صحیحة ولیس بربا حرمه القرآن والضمان لیس بربح للمبلغ المدفوع وإنما هو عون یدفع الخسار وإذا أمن احد حیاته الیوم بالفین علی ان یدفع کل شهر خمسة ومات من الغد فإن الشرکة تدفع لورثته الالفین ولا یمکن ان یعتبر الألفان ربح خمسة فی یوم واحد".

(بیمہ کمپنی میں شرکت اختیاری ہے اور حادثہ کے وقت کمپنی جو ضمان ادا کرتی ہے وہ باہمی تعاون وتکافل کی صورت ہے، ادا کی

ہوئی رقم کا نفع نہیں ہے کمپنی مجموعی رقم کو تجارت یا اور کسی نفع مند کام میں لگاتی ہے وہ مضاربت کی صورت ہے اور نفع جو حاصل ہوتا ہے وہ سود نہیں ہے جس کو قرآن حکیم نے حرام کیا ہے بلکہ تجارت کا نفع ہے۔اس نفع سے ضمان کی رقم کا کوئی تعلق نہیں ہے وہ رقم محض نقصان کی تلافی کے لئے بطور امداد دی جاتی ہے چنانچہ آج جب دو ہزار پر (مثلا) زندگی کا بیمہ کیا اور پانچ روپیہ ماہوار پر قسط کی ادائیگی طے ہوئی اور طے ہوا کہ ہر مہینہ پانچ روپے ادا کرے گا اور اگلے ہی دن اس کا انتقال ہوگیا تو ایسی صورت میں کمپنی اس کے ورثہ کو دو ہزار رقم ادا کرتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ دو ہزار ایک دن کے پانچ روپیہ کا نفع نہیں قرار پاسکتے ہیں)

بیمہ میں شرعی نقطۂ نظر سے دو قسم کے خطرے بیان کئے جاتے ہیں (۱) قمار اور (۲) سود، مذکورہ عبارت میں دونوں کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔پھر اس کے بعد کی عبارت یہ ہے۔

"ان التامین وتاسیس شرکة التامین امر حسن نافع مطلوب لا یمکن ان یرتاب فیه فقیه ناصح امین".

(بیمہ کا معاملہ اور بیمہ کمپنی کی تاسیس امر حسن اور نافع ہے کسی خیر خواہ امانتدار فقیہ کو اس میں شک کی گنجائش نہ ہونی چاہئے)

جس طرح امانتدار وخیر خواہ فقیہ کو بیمہ کا مسئلہ حل کرنے میں مفاد عامہ کی رعایت ضروری ہے، اسی طرح ان پہلوؤں کی وضاحت بھی لازمی ہے جو اس مسئلہ میں واقعی قابل غور ہیں۔نصیحت، رعایت، کفالت یہ تینوں بنیادیں اپنی جگہ اہم ہیں اور بیمہ کے افادی پہلو پر غور کرتے وقت بڑی حد تک ان سے کام لیا جاسکتا ہے لیکن دوسرے قابل اعتراض پہلوؤں کو نظر انداز کرکے صرف انہیں کو مدار قرار دے لے لینا کسی طرح مناسب نہیں

ہے۔ایسے ہی مضاربت کی مقررہ شرطوں اور شکلوں کی رعایت کئے بغیر بیمہ کو اس پر قیاس کر کے مستحسن قرار دینا بھی قیاس کے اصول وضوابط کی خلاف ورزی ہے۔

زندگی کے نئے نقشہ میں بیمہ کی اہمیت سے انکار نہیں ہے اور موجودہ دور کی اکثر حالتوں میں اس کی افادیت بھی مسلم ہے، لیکن بیمہ کی مروجہ شکلوں میں جب تک اصول وکلیات کی روشنی میں غور وخوض نہ ہوگا اس وقت تک ہر فیصلہ ناقص ہی سمجھا جائے گا۔

مصر میں بیمہ کے موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ

بیمہ کی اہمیت وضرورت کے پیش نظر مصر میں ۱۳۷۴ھ م ۱۹۵۵ء میں اس موضوع پر گفتگو کے لئے ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی جس میں ممتاز علماء نے شرکت کی ان سب حضرات کی تفصیلی گفتگو نقل کرنا دشوار ہے البتہ چند رائیں ذکر کی جاتی ہیں جن سے موضوع کے اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

استاذ خلاف کی رائے اور مؤیدین حضرات

استاذ عبدالوہاب خلاف کی رائے میں بیمہ کی غرض وغایت صرف آمدنی کے ایک حصہ کو محفوظ کرنا اور جمع رکھنا ہے تاکہ وقت ضرورت کام آئے، یہ آمدنی کے پس انداز کرنے کا ایک اختیاری معاملہ ہے۔اس کے ذریعہ نہ زندگی کی کوئی ضمانت حاصل ہوتی ہے اور نہ تقدیر کی مخالفت کا سوال پیدا ہوتا ہے، جو لوگ بیمہ میں تقدیر کے مقابلہ کا اعتراض کرتے ہیں وہ اس کے نام سے دھوکہ کھاتے ہیں، میرے نزدیک ''تامین علی الحیاۃ'' کے نام سے اس کو موسوم کرنا ہی غلط ہے۔

بیمہ موجودہ دور کی پیداوار ہے، قرآن وسنت میں صراحۃً اس کے ذکر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ لامحالہ اس کو حل کرنے کے لئے ''اجتہاد'' کی ضرورت ہوگی اور صورت یہ اختیار کرنی پڑے گی کہ پہلے شریعت کے عمومی قواعد پر بیمہ کے نظام کو منطبق کیا جائے، پھر کسی ایسی نظیر پر قیاس کیا جائے جو نص صریح سے ثابت ہو۔ یا یہ صورت اختیار کی جائے کہ بیمہ کے مصالح اور مقاصد پر غور کیا جائے اور ان طریقوں کو کام میں لایا جائے جو شریعت

نے غیر منصوص احکام میں اجتہاد کے لئے مقرر کئے ہیں۔

بیمہ جیسے تمام شہری ضروریات کے حامل معاملات میں اجتہاد کا اساسی اصول حصول مصالح اور دفع مضار ہونا چاہئے۔ یہ معاملات اگر نفع محض کا سبب بنتے ہوں یا مضرت پر نفع کا غلبہ رہتا ہو تو مباح ہوں گے، اور جن میں ضرر محض پایا جاتا ہو یا نفع پر ضرر کا غلبہ ہو تو وہ ناجائز قرار پائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام'' (اسلام میں نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہونچانا ہے)۔(۱)

استاذ خلاف نے بیمہ کو مفاد عامہ کے پیش نظر جائز قرار دیا ہے اور مضاربت کے تحت لاکر بعض اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مجلس میں استاذ منصور رجب اور استاذ سلیمان العقاد نے اپنے اپنے انداز میں استاد خلاف کی رائے کی تائید کی تھی۔

استاذ محمد البناء کی رائے

بیمہ بالکل جدید عقد ہے جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی ہے۔ نئے مسئلہ میں اجتہاد کا طریقہ یہ ہے کہ اگر وہ کسی شرعی عقد کے موافق یا اس سے مشابہ ہے تو اس کے ساتھ وہ ملحق کر دیا جائے، بشرطیکہ دونوں میں کوئی بنیادی فرق ایسا نہ ہو جو حکم پر اثر انداز ہو سکے، شرعی عقود کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بیمہ نہ کسی عقد کے مشابہ ہے اور نہ موافق ہے۔ عقد مضاربت کی ظاہری شکل دیکھ کر بعض حضرات نے بیمہ کو اس کے ساتھ ملحق کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن دونوں میں کئی بنیادی فرق موجود ہیں، مثلاً

(۱) مضاربت کی شرط ہے کہ منافع کی رقم نصف ثلث وغیرہ نسبت سے طے کی جائے متعین نہ ہو اور بیمہ میں رقم کا تعین ہوتا ہے نسبت سے نہیں طے پاتی ہے۔

(۲) منافع کے تعین کو جائز مان لیا جائے تو خسارہ کا تعین بھی ہونا چاہئے حالانکہ کمپنی کو اگر خسارہ ہو تو بیمہ دار کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام، رقم الحدیث: ۲۳۴۱۔

(۳) مضاربت میں اگر رقم والے شریک کا انتقال ہو جائے تو ورثاء کو حوالہ کی ہوئی رقم مل جائے گی زائد نہ ملے گی اور بیمہ دار کا انتقال ہو جائے تو زر بیمہ کی پوری رقم مستحقین کے حوالہ کی جائے گی اگر چہ معاملہ کرنے کے بعد دوسرے ہی دن انتقال ہوا ہو۔ اور برائے نام رقم ادا کرنے کی نوبت آئی ہو۔

ان وجوہات کی بناء پر بیمہ کو نہ مضاربت پر قیاس کرنا صحیح ہے اور نہ یہ معاملہ شرعاً جائز ہے۔

دیگر شرکاء مجلس کی رائیں:۔

مجلس کے شرکاء میں استاذ صبری عابدین نے جوا اور سود کی وجہ سے فیصلہ میں جلد بازی سے روکا ہے اور مزید تحقیق واحتیاط سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔

ایسے ہی استاذ حنفی احمد نے بھی مزید تحقیق اور غور وفکر کی تاکید کی اور بعجلت فیصلہ سے منع کیا ہے، مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی نے بیمہ کے معاملہ پر شبہ کا اظہار کیا اور مزید مطالعہ وگہرائی کے ساتھ فیصلہ کی جانب توجہ دلائی ہے۔

استاذ خطاب محمد نے حمل ونقل میں دشواری اور مجبوری کی وجہ سے بحری بیمہ کی اجازت دی ہے، اور زندگی کے بیمہ کے لئے کہا کہ انسان اس سے بچنے کی آزادانہ کوشش کرسکتا ہے۔ استاذ عبدالوہاب حمودہ نے کہا کہ اگر کچھ بیمہ کمپنیاں ایسی ہوں جو ناجائز معاملات نہ کرتی ہوں تو ایسی کمپنیوں سے بیمہ کا معاملہ درست ہے۔

بقیہ شرکاء شیخ عبدالعلیم سبیونی، استاد کامل البناء، استاد عبدالعزیز علی، استاذ مصطفیٰ زید نے استاذ محمد بناء کی رائے کی تائید کرتے ہوئے ناجائز قرار دیا ہے اور استاذ ابوزہرہ نے زیادہ مدلل طریقہ پر عدم جواز کے بارے میں گفتگو کی جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔(۱)

بیمہ کے مسئلہ پر غور کے لئے ایک اور پہلو:۔

مصر کے بعض حضرات نے بیمہ کے مسئلہ پر ایک اور پہلو سے غور کیا ہے جو اپنے

(۱) لواء الإسلام مارچ ۱۹۵۵ء از برہان۔

طرز استدلال کی بناء پر ذکر کئے جانے کے لائق ہے وہ یہ ہے۔

پرائیویٹ کمپنیوں میں شرعی قباحتوں کی وجہ سے بیمہ ناجائز ہے لیکن اگر حکومت کے زیر انتظام وانصرام بیمہ کا کام انجام پائے تو جائز ہے۔ کیونکہ کمپنیوں پر رعایا کی رعایت وکفالت کی باضابطہ کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی ہے محض کاروبار کے طریقہ پر وہ اس نظام کو چلاتی ہیں اور ضمناً بیمہ کرانے والوں کو کچھ فائدہ پہونچ جاتا ہے۔

لیکن حکومت رعایا کی رعایت وکفالت کی باضابطہ اور سب سے بڑی ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے ایسی صورتیں اور شکلیں تجویز کرے جن کے ذریعہ غیر معمولی حالات اور ہنگامی حادثات کی تلافی ہوتی رہے۔

اس طریق استدلال میں سود کی بحث نظر انداز ہو جاتی ہے کیونکہ حکومت منافع کے نام سے جو رقم دیتی ہے وہ سرکاری خزانہ سے دیتی ہے اور خزانہ میں بیمہ کے بغیر ہی سب کا مساوی حق ہے۔

پھر حکومت ٹیکس وغیرہ مختلف ذرائع سے کافی رقم رعایا سے وصول کرتی رہتی ہے جس کی بناء پر وہ فلاح وبہبود کے جملہ امور میں خرچ کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اب اگر غیر معمولی حالات وہنگامی حادثات میں بیمہ کے ذریعہ سرکاری خزانہ سے اپنا حق وصول کیا جائے تو اس میں کیا قباحت ہوگی؟ اور یہ زائد رقم سود کیونکر قرار پائے گی؟(۱)

شام میں بیمہ کے مسئلہ پر غور وفکر کے لئے ایک علمی مجلس

بیمہ کے مسئلہ پر غور وفکر کے لئے ۱۳۸۰ھ م ۱۹۶۱ء میں جامعہ دمشق (شام) کی علمی مجلس نے اپنے ممتاز نمائندوں کو دعوت دی اور ایک ہفتہ تک برابر اس پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا متعدد مقالات پڑھے گئے اور مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی۔ ذیل میں مجلس کے دو ایسے رکن کے خیالات پیش کئے جاتے ہیں جو عالم اسلام کے بلند پایہ مصنف اور فقہ وشریعت کے متخصص ہیں۔ میری مراد جامعہ دمشق کے استاذ قانون مصطفیٰ احمد زرقاء اور

(۱) الإسلام والاشیوعیۃ ص ۱۴۵۔

جامعہ قاہرہ کے استاذ شریعت شیخ محمد ابوزہرہ سے ہے۔

مصطفیٰ زرقاء کی رائے:۔

مصطفیٰ زرقاء نے بیمہ کی تاریخ اور رواج پانے کے عوامل واسباب پر طویل بحث کرکے بیمہ کا جواز ثابت کیا ہے اور فقہ کے باب تضامن سے اس کو متعلق کیا ہے جس میں ضمان ومعاوضہ کے ذریعہ باہمی تعاون کی شکل پائی جاتی ہے۔ مثلاً فقہ کا یہ جزئیہ کہ اگر کسی شخص نے دوسرے سے کہا کہ "**اسلک هذ الطريق فانه آمن و ان اصابک فيه شئ فانا ضامن**" (یہ راستہ چلنے کے لئے اختیار کرو اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے اور اگر تمہیں کوئی نقصان پہونچے گا تو میں ضامن ہوں)۔

باب الکفالۃ میں تصریح ہے کہ اگر راہ پر خطر ہے اور چلنے والے کا نقصان ہوگیا تو کہنے والا ضامن ہوگا۔

زرقاء صاحب نے بیمہ کے موضوع پر اصولی گفتگو کی ہے اور اجتماعی تعاون وہمدردی کی کئی شکلیں بیان کرکے موجودہ دور میں تقریباً اسی انداز کی ایک شکل بیمہ کو قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک بیع، اجارہ وغیرہ عقود کی طرح بیمہ بھی ایک عقد ہے جو فی نفسہ جائز ہے جس طرح تمام جائز عقود میں خلاف شریعت شرطیں ناجائز ہوتی ہیں اور اصل عقد جائز قرار پاتا ہے اسی طرح بیمہ میں بھی ایسی شرطیں ناجائز ہیں اور اصل صورت جائز ہے چنانچہ اسی بنیاد پر وہ تمام شکلوں کو درست تسلیم کرتے ہوئے سود کو بدستور حرام کہتے ہیں اور اس کی کوئی تاویل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

شیخ ابوزہرہ کی رائے:۔

مجلس کے اہم رکن شیخ ابوزہرہ کی رائے اس کے خلاف ہے وہ بیمہ کمپنیوں کے ساتھ معاملہ کو ناجائز کہتے ہیں لیکن اگر حکومت اپنے ملازمین کے درمیان کوئی ایسا اجتماعی نظام قائم کرے تو اس کو جائز سمجھتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

"**فموضع الخلاف محدود محصور فی العقود مع الشركات التی صناعتها الاستغلال عن طريق التامين فالتامينات الإجتماعية التی تقوم بها الدولة سواء كانت بين العمال ام كانت بين المؤظفين وسواء كانت شاملة لها صفة العموم ام كانت خاصة ببعض الطوائف صحيحة مباحة ليس لنا اعتراض عليها وهی تعاون اجتماعی**".

(اختلاف محدود ہے بیمہ کمپنیوں کے درمیان جو اپنے کاروباری نقطۂ نظر سے بیمہ کے ذریعہ نفع کماتی ہیں لیکن وہ اجتماعی بیمے جو حکومت کے زیر انتظام ہوں خواہ مزدوروں کے درمیان ہوں یا سرکاری ملازمین کے درمیان عمومیت کی صفت ان میں پائی جائے یا بعض گروہ کے ساتھ مخصوص ہوں یہ سب درست اور مباح ہیں ان کے بارے میں ہمارا کوئی اعتراض نہیں ہے یہ اجتماعی تعاون کی شکل ہے۔)

دراصل شیخ صاحب بھی بیمہ کی اصلیت تعاون محض تسلیم کرتے ہیں لیکن جب وہ کاروباری حیثیت میں تبدیل ہوکر علی الاعلان نفع کمانے کا ذریعہ بن گیا تو اب ان کے نزدیک اصل حیثیت سے استدلال کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ شراب اس لئے حلال ہے کہ وہ انگور جیسی حلال چیز سے بنائی گئی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر بیمہ کو جائز قرار دے کر اس طرح استحصال زر کا دروازہ کھول دیا گیا تو پھر اس پر کوئی حد بندی وپابندی نہ ہوسکے گی اور بیمہ کی ایسی عجیب وغریب شکلیں رائج ہوجائیں گی جن کا ضروریات زندگی سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔(۱)

(۱) حضارۃ الإسلام نومبر ۱۹۶۱ء۔

بیمہ کے بارے میں علماء کے چار گروہ:۔

بیمہ کے سلسلے میں اب تک علماء وفقہاء کے جو خیالات ذکر کئے گئے ہیں ان کے لحاظ سے یہ حضرات چار گروہ میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) ایک گروہ ہر قسم کے بیمہ کو حرام وناجائز کہتا ہے اس کے نزدیک اموال کے بیمہ میں جوا اور دھوکہ کی شکل ہے جو حرام ہے۔ اور زندگی کے بیمہ میں قضاء وقدر کا مقابلہ ہے۔

(۲) دوسرا گروہ بیمہ کے معاملہ میں متردد ہے وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکا ہے۔ جب اس کی نظر موجودہ دور کی ضرورتوں اور مجبوریوں پر جاتی ہے تو بعض صورتوں کو جائز کہتا ہے اور بعض کو ناجائز لیکن جب اپنے خیال کے مطابق شرعی قباحتوں پر نظر ڈالتا ہے تو تمام صورتوں میں متردد بن جاتا ہے۔

(۳) تیسرا گروہ بیع واجارہ کی طرح بیمہ کو ایک عقد قرار دے کر اس کی تمام شکلوں کو جائز کہتا ہے البتہ سود کو بدستور حرام کہتا ہے۔ چنانچہ اس کا خیال ہے۔

"ان التأمين بكل انواعه ضرب من ضروب التعاون التى تفيد المجتمع والتأمين على الحياة يفيد المومن كما يفيد الشركة التى تقوم بالتأمين ايضاً أرى شرعا أنه لا بأس به اذا خلا من الربا بمعنى ان المومن عليه اذا عاش المدة المنصوص عليها فى عقد التأمين استرد ما دفعه فقط دون زيادة أما اذا لم يعش المدة المذكورة حق لورثته ان ياخذوا قيمة التامين أى التعويض وهذا حلال شرعاً".

(بیمہ کی تمام قسمیں باہمی تعاون کی ان شکلوں سے تعلق رکھتی ہیں جن سے معاشرہ کو فائدہ پہونچتا ہے اور بیمہ زندگی میں جس طرح بیمہ دار کو فائدہ پہونچتا ہے اسی طرح بیمہ کمپنی کو فائدہ ہوتا ہے اس

بناء پر ہمارے خیال میں اگر سود نہ لیا جائے تو شرعا اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ صورت یہ اختیار کی جائے کہ جب بیمہ دار مدت مقررہ تک زندہ رہے تو صرف قسطوں سے ادا کی ہوئی اپنی رقم واپس لے سود کی زائد رقم نہ لے اور اگر وہ نہ زندہ رہے تو ورثاء کو حق ہے کہ بیمہ کی قیمت یعنی ادا کی ہوئی رقم کا معاوضہ وصول کر لیں زائد نہ لیں یہ شرعا حلال ہے۔)

(۴) چوتھا گروہ قوم وملت کے موجودہ مصائب اور حکومتوں کی نااہلی کی بناء پر نہ صرف بیمہ کی تمام شکلوں کو جائز کہتا ہے بلکہ سود والی شکل کو بھی یہ کہہ کر جائز قرار دیتا ہے کہ زائد رقم تجارتی نفع ہے سود نہیں کہ جس کو حرام کیا جائے اور تائید کے لئے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پیش کرتا ہے۔

"انک ان تذر ورثتک اغنياء خير من ان تذرهم عالة يتكففون الناس" (اپنے ورثاء کو غنی چھوڑو یہ اس سے بہتر ہے کہ ان کو مفلس وقلاش چھوڑو کہ اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں)(۱)

ان تفصیلات کے بعد چند وہ بنیادیں متعین کی جاتی ہیں جن کی روشنی میں مجلس کو غور وفکر کرنا ہے۔

غور وفکر کی پہلی بنیاد:۔

(۱) خطرات سے حفاظت اور مستقبل کی ضمانت حاصل کرنے کا جذبہ انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ اس جذبہ کو نہ کھرچ کر پھینکا جاسکتا ہے اور نہ اس کو دبانے کی کوشش میں پوری کامیابی ہوتی ہے۔

انسان اپنی حفاظت وضمانت کے لئے پیش بندی کے طور پر اضطراری واختیاری

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، رقم الحدیث: ۱۲۹۵۔

بہت سے انتظامات کرتا ہے اور آفات وحوادث کی نئی نئی شکلوں کے ساتھ حفاظت وضمانت کی نئی نئی اسکیمیں بروئے کار لاتا ہے۔

گویا قدرت ہر دور میں نئے تغیرات کے ذریعہ انسان کی آزمائش کرتی ہے اور انسان نئے وسائل وذرائع کے ساتھ ان تغیرات کی آزمائش کرتا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ انسان کو اس میں کس حد تک کامیابی ہوتی ہے اور ہمیشہ اس کی بے بسی ظاہر ہو کر رہتی ہے۔

سلسلۂ آزمائش میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر نہ صرف کائنات ہست وبود کی نیرنگیاں قائم ہیں بلکہ بڑی حد تک بقاء وارتقاء کا راز بھی اس میں پوشیدہ ہے۔ انسان مادی ومعنوی وسائل کے ذریعہ جس قدر نئے تغیرات کو جذب وانگیز کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے اسی مناسبت سے اپنا مقام متعین کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

جدید دور کے انسان نے مذکورہ جذبہ اور قدرتی آزمائش کے تحت جس طرح سیلاب وغیرہ سے تحفظ کا بندوبست کیا ہے اور بیرونی حملوں سے مدافعت کے لئے نئی نئی تدبیریں سوچی ہیں اسی طرح زندگی کے ناگہانی حادثات وخطرات میں حصول استطاعت کے لئے بیمہ کی اسکیم وضع کی ہے۔

بیمہ کی ابتدائی تفصیلات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس میں حفاظت وضمانت کے جذبہ کو کافی دخل ہے اور باہمی تعاون کے ساتھ اجتماعی جرمانہ کی شکل سے بھی اس کو مشابہت ہے۔

اسلام نے نہ اس فطری جذبہ کی مخالفت کی ہے اور نہ اس کا نظام اجتماعی جرمانہ کی شکلوں سے تہی دامن ہے۔ اس بناء پر مقررہ قاعدہ کے مطابق اس کا حل تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہ ہونی چاہئے۔

دوسری بنیاد:۔

(۲) نئے حالات وتقاضہ کے پیش نظر عقود ومعاملات کی نئی شکلیں ایجاد ہو سکتی ہیں یا پرانی ہی شکلیں نئی ضرورتوں کی کفالت کے لئے کافی ہیں؟

جن لوگوں نے قدیم وجدید حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے انہیں اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ عقود ومعاملات کی قدیم شکلیں موجودہ تمام ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہیں، بلکہ نئے حالات نے ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا ہے کہ عقود ومعاملات میں وسعت وفراخی سے کام کئے بغیر چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ جب زمانہ خود تغیر پذیر ہے تو حاجت وضرورت کی شکلیں کیونکر تغیر پذیر نہ ہوں گی؟ اور پھر ان کو سمیٹنے والے عقود ومعاملات کس طرح جامد قرار پا سکیں گے؟

فقہ اسلامی کے تدریجی ارتقاء سے ثابت ہے کہ ماہرین شریعت کبھی اس باب میں جمود وخمود کے شکار نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہمیشہ فراخ حوصلگی سے کام لیتے رہے ہیں۔ اور ترتیب وتدوین کے بعد بھی فقہ اسلامی کی تاریخ ایسے نئے عقد سے خالی نہیں ہے کہ جس پر حالات وتقاضہ کے دباؤ کی وجہ سے غور نہ کیا گیا ہو اور قابل قبول صورت نکال کر اس پر عمل درآمد نہ ہوا ہو۔ مثلاً پانچویں صدی ہجری کے آخر میں ''بیع الوفاء'' کا ذکر ملتا ہے کہ اس سے پہلے فقہ کی کتابوں میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔

بیع الوفاء کی صورت یہ ہے ''**ھو ان یبیع المحتاج الی النقد عقارا علی انه متی رد الثمن استردا لعقار**'' (ایک ضرورتمند شخص (مثلاً) اپنی زمین کو اس شرط پر فروخت کرے کہ جب وہ رقم واپس کرے تو زمین کو واپس لے لے)۔

اس صورت میں رقم کی واپسی سے پہلے خریدار زمین سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے جو بلاعوض ہوتا ہے اور سود کی شکل پائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود فقہاء نے ضرورت کی بناء پر وسعت سے کام لے کر جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

بیع الوفاء کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال درج ذیل ہیں۔

(۱) بعض علماء نے بیع قرار دے کر اس کو بیع فاسد کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔

(۲) بعض نے بیع صحیح تسلیم کر کے واپسی کی شرط کو لغو بتایا ہے۔

(۳) بعض نے غرض وغایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو ''راہن'' ثابت کیا

اور مدت مقررہ میں انتفاع کی شرط کو لغو ٹھہرایا ہے۔

لیکن شیخ بدرالدین محمود نے اپنی کتاب ''جامع الفصولین'' میں امام نجم الدین عمر بن محمد نسفی کے فتاوی سے جو عبارت نقل کی ہے اس سے اصل واقعہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ یہ ہے۔

''البیع الذی تعارفه اهل زماننا احتیالا للربا، وسموه بیع الوفاء، هو رهن فی الحقیقة لایملکه المشتری ولا ینتفع به الا باذن مالکه وهو ضامن لما اکل من ثمر واتلف من شجرة ویسقط الدین عملا له فرق عندنا بیننا وبین الرهن فی حکم من الاحکام، لان المتعاقدین وان سمیاه بیعا ولکنه عرفا الرهن والاستیثاق بالدین اذا العاقد هی البائع یقول کفل احد بعد هذا العقد رهنت ملکی فلانا، والمشتری یقول ارتهنت ملک فلان والعبرة فی التفرقات للمقاصد والمعانی، فهبة المرأة نفسها مع تسمیة المهر وحضرة الشهود نکاح وهکذا''.

(جو بیع ہمارے زمانہ میں سود کے لئے حیلہ کی شکل میں رائج ہے اور لوگ اس کو بیع الوفاء کہتے ہیں وہ دراصل ''رہن'' ہے نہ مشتری اس کا مالک ہوتا ہے اور نہ مالک کی اجازت کے بغیر مشتری کا اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ رہن کے قاعدہ کے مطابق مشتری اس کا پھل کھائے گا یا درخت کو ضائع کرے گا تو اس پر ضمان واجب ہوگا اور اگر وہ شئی ہلاک ہو جائے گی تو دین ساقط ہو جائے گا۔ صاحب معاملہ اگرچہ اس کو بیع کہتے ہیں لیکن عرف میں یہ رہن ہے اور دین

کی ضمانت کے لئے مستعمل ہے چنانچہ عام طور پر معاملہ کے وقت یہ کہا جاتا ہے ''رہنت ملکی فلانا'' اور مشتری کہتا ہے ''ارتہنت ملک فلان''۔ تصرفات میں مقاصد و معانی کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ الفاظ ونقوش کا(۱)۔ جیسا کہ کوئی عورت کہے کہ تعیین کے ساتھ گواہوں کے روبرو یہ کہے کہ میں نے اپنے کو ہبہ کر دیا تو یہ نکاح سمجھا جائے گا(۲)، یہی حال دیگر عقود و معاملات کا ہے غرض ہمارے نزدیک اس بیع اور رہن میں کوئی فرق نہیں ہے۔)

پھر آگے کی عبارت یہ ہے۔

''قال السید الامام قلت للامام الحسن الماتریدی قد فشا هذا البیع بین الناس وفتواک انه رهن وانا ایضا علی ذلک فالصواب ان نجمع الائمة ونتفق علی هذا ونظهره بین الناس فقال المعتبر الیوم فتوانا وقد ظهر بین الناس فمن خالفنا فلیبرز نفسه ولیقم دلیله''. (۳)

(سید امام نے کہا کہ میں نے امام حسن ماتریدی سے عرض کیا کہ لوگوں میں یہ معاملہ بیع کے نام سے رائج ہے اور آپ کا فتوی اس کے رہن ہونے کا ہے میں خود بھی رہن سمجھتا ہوں، ایسی حالت میں کیا یہ بات زیادہ مناسب نہیں ہے کہ ائمہ کو جمع کر کے کسی ایک بات پر اتفاق کر لیں اور پھر طے شدہ بات کا اعلان کر دیں؟ ماتریدی نے اس کے جواب میں کہا کہ آج ہمارا ہی فتوی معتبر مانا جاتا ہے جو شخص ہماری مخالفت کرتا ہے وہ کھل کر سامنے آئے اور

(۱) العبرة للمقاصد لا للمعانی، (الأشباہ والنظائر)۔

(۲) چونکہ اصول فقہ کا قاعدہ ہے کہ سبب بول کر مسبب مراد لینا جائز ہے۔ (اصول الشاشی، باب الإستعارہ)

(۳) جامع الفصولین جزء اول ۲۳۴۔

اپنی دلیل قائم کرے۔)

یہاں اس سے بحث نہیں کہ بیع الوفاء رہن ہے یا بیع ہے بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ جب ایک نیا عقد رواج پا گیا اور لوگوں کی ضرورتیں اس سے وابستہ ہوگئیں تو علماء نے اس پر غور وفکر کر کے حتی الامکان راہیں نکالنے کی کوشش کی چنانچہ ابن نجیم صاحب الاشباہ والنظائر نے **الضرورة تُبيح المحظورات** کے تحت لکھا ہے۔

"ومنها الافتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على اهل بخارىٰ وهكذا بمصر وقد سموه بيع الامانه" (۱)

(اور اسی اصول کی بناء پر بخاریٰ اور مصر میں بیع الوفاء کی صحت کا فتویٰ دیا گیا جبکہ اہل بخاریٰ ومصر پر قرض زیادہ ہوگیا تھا اور اس کا نام بیع الامانۃ رکھا گیا)

المجلۃ میں بیع الوفاء کی صحت کا ذکر نہایت اہتمام سے کیا گیا ہے اور آخر میں اراکین بورڈ کے دستخط بھی موجود ہیں (۲)۔ بعض نئی عادات وضروریات کے تحت (۱۲۸۶ھ ۱۸۶۳ء) ترکی میں حکومتی سطح پر فقہ کے سول احکام کو جدید انداز میں مرتب کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس اہم کام کے لئے درج ذیل منتخب علماء پر مشتمل ایک بورڈ بنایا گیا تھا جس میں علامہ شامی کے صاحبزادہ بھی تھے۔

(۱) احمد جودت (۲) السید خلیل (۳) سیف الدین (۴) السید احمد خلوص (۵) السید احمد حلبی (۶) محمد امین جندو (۷) علاء الدین ابن عابدین۔

اس بورڈ نے کئی سال کی محنت کے بعد ایک مجموعہ مجلۃ الاحکام الشرعیۃ مرتب کیا جو "المجلۃ" کے نام سے مشہور ہے۔ ترتیب کے بعد شعبان ۱۲۹۳ھ میں ایک فرمان سلطانی کے ذریعہ پوری دولت عثمانیہ کی عدالتوں میں "المجلۃ" پر عمل کرنا اور اس کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔

(۱) الأشباہ والنظائر ۱۲۹۔ (۲) ملاحظہ ہو مجلۃ الأحکام الشرعیۃ ۶۸۔

"المجلۃ" دراصل فقہ حنفی کے احکام کو جدید طور پر قانونی انداز میں مرتب کرنے کی ایک کوشش تھی جس میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر مسئلہ کو اس جگہ رکھا جائے جس جگہ موجودہ زمانہ میں اس کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً عقد مضاربہ کا ذکر الشرکۃ کے تحت ہے جبکہ قدیم ترتیب میں (قدوری کے علاوہ) اس کی یہ جگہ نہیں ہے۔

اسی طرح فقہاء کے اختلاف اور فقہی اقوال کا اس میں تذکرہ نہیں ہے نیز وقتی حالات ومصالح کی بناء پر بعض ان اقوال کو ترجیح دی گئی ہے جو فقہ حنفی میں مرجوح قرار پائے ہیں البتہ اس مجموعہ میں دیگر ائمہ کے اقوال وطرز استنباط سے استفادہ کی کوشش نہیں کی گئی ہے صرف فقہ حنفی کی موافقت کا التزام ہے جس کی بناء پر یہ مجموعہ بدلتے ہوئے حالات وضروریات کو سمیٹنے میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکا اور مجبوراً ۱۳۳۲ھ میں بعض ایسی قانونی اساس کو واضح کیا گیا جس میں کسی ایک امام سے استفادہ کا التزام نہ تھا بلکہ مختلف ائمہ کی وسعتوں سے استفادہ کی کوشش کی گئی تھی۔ (۱)

جواز کے فتویٰ پر علماء کا اگرچہ اتفاق نہ ہوسکا تھا (جیسا کہ مختلف اقوال سے معلوم ہو چکا ہے) اور اس قسم کے مسائل میں اتفاق کی توقع تدبر میں کمی کی دلیل ہے۔ لیکن حالات کے دباؤ کی وجہ سے یہ فتویٰ اس مرحلہ پر یقیناً پہونچ گیا تھا کہ لوگوں کی ضرورتیں اس سے پوری ہوتی رہیں بس اسی قدر رہنمائی کے لئے کافی ہے۔

تیسری بنیاد

مروجہ مراسم وقوانین کے بارے میں جن لوگوں نے انبیائی طرز عمل کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ غالباً اس حقیقت سے انکار نہ کرسکیں گے کہ اسلام کا مزاج "ازالہ" کا نہیں بلکہ امالہ کا ہے۔ یعنی انبیاء علیہم السلام مسائل حل کرنے میں شمشیر بے نیام نہیں ہوتے ہیں کہ ہر مروجہ چیز کو ختم کر دیا اور ہر پسندیدہ بات سے لوگوں کو روک دیا بلکہ یہ حضرات نفسیاتی ومعاشرتی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے **"خذما صفا ودع ما كدر"** کے اصول پر

(۱) المدخل الفقہی العام ۴۷۴۔

عمل کرتے ہیں۔جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

''انبیاء علیہم السلام اللہ رب العزت کی طرف سے جو احکام وشرائع لاتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قوم کے پاس معاشرت ومعاملات وغیرہ کے جو قواعد وقوانین پہلے سے موجود ہوتے ہیں ان میں وہ اصلاحی اور انتفاعی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں۔کھانے پینے کے آداب ،لباس عمارت، زیب وزینت کے طور طریقے، بیع وشراء کے احکام، نکاح کے قوانین اور ان کے علاوہ جرائم سے روک تھام اور تصفیۂ معاملات وغیرہ سے متعلق اصول وضوابط جو لوگوں میں رائج ہوتے ہیں اگر وہ مجموعی طور پر شریعت کی پالیسی اور رائے کلی کے مطابق ہوتے ہیں تو یہ حضرات ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کو تقویت پہونچاتے اور لوگوں کو ان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔اور اگر وہ شریعت کی کلی پالیسی کے مطابق نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان میں اجتماعی وانفرادی ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے نیز لذات دنیوی میں انہماک اور روح شریعت سے اعراض پر مبنی ہوتے ہیں یا دینی ودنیوی مصلحتوں کے فوت ہونے کا خطرہ رہتا ہے جن کی بناء پر مروجہ احکام ورسم میں تبدیلی یا انہیں بالکلیہ ختم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو ایسی حالت میں بھی یہ حضرات لوگوں کی مرغوبات ومالوفات کی حتی الامکان رعایت کرتے ہیں اور بالکلیہ ان کی ضد کی طرف دعوت نہیں دیتے ہیں بلکہ مماثل ومشابہ جو چیزیں قوم میں رائج ہوتی ہیں یا صالح شخصیتوں کی طرف جو مشہور ومنسوب ہوتی ہیں ان کے مماثل و مشابہ کی طرف قوم کو دعوت دیتے ہیں''۔(۱)

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ ۱۰۳۔

ایک اور موقع پر شاہ صاحب کہتے ہیں:

''فما كان صحيحا موافقا لقواعد السياسة الملية لا يغير بل تدعوا اليه وتحث عليه وماكان سقيما قد دخله التحريف فانه تغيره بقدر الحاجة وماكان حريا ان يزاد فانها تزيد على ماكان عندهم'' (۱)

(ان احکام ومراسم میں جو باتیں صحیح اور ملی سیاست کے اصول کے مطابق ہوتی ہیں انبیاء علیہم السلام ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی طرف دعوت دیتے اور قوم کو ابھارتے ہیں اور جو باتیں بری اور تحریف شدہ ہوتی ہیں بقدر ضرورت ان کی اصلاح کردیتے ہیں اور جن میں زیادتی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ان میں اضافہ کردیتے ہیں)۔

انبیاء علیہم السلام کا طریقۂ کار ذکر کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب آخری ہدایت کی یہ تفصیل بیان کرتے ہیں۔

''ان كنت تريد النظر فى معانى شريعة رسول الله فتحقق اولا حال الاميين الذين بعث فيهم التى هى مادة تشريعه وكيفية اصلاحه لها بالمقاصد المذكورة فى باب التشريع والتيسير واحكام الملة''(۲)

(اگر تم رسول اللہ کی شریعت کی گہرائیوں کو سمجھنا چاہو تو پہلے عرب امیین کے حال کی تحقیق کرو جن میں رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تھے وہی آپ کی شریعت کا تشریعی مادہ ہیں پھر اصلاح کی کیفیت کو سمجھو جو آپ نے ان مقاصد کے تحت کی ہیں جو تشریع

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ ۹۰۔ (۲) حجۃ اللہ البالغۃ ۱۲۳۔

وتیسیر اوراحکام ملت کے باب میں مذکور ہوچکی ہے۔)

بات دراصل یہ ہے کہ جو شرائع واحکام قوم میں رائج ہوتے ہیں ان کے کچھ محرکات واسباب ہوتے ہیں اور لوگوں کی ضرورتیں ان سے وابستہ ہوتی ہیں "**ان الشرائع لها معدات واسباب تشخصها وترجح بعض مشتملاتها على بعض**"(۱) (شرائع (جزوی احکام وقوانین) کے لئے محرکات واسباب ہوتے ہیں جو ان کی تعیین کرتے ہیں اور بعض احتمالات کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں)۔

ظاہر ہے کہ جب تک محرکات واسباب پر غور کر کے متعلقہ ضرورتوں کے رفع ہونے کا عملا کوئی حل نہ نکالا جائے گا ان کے بارے میں جارحانہ پوزیشن اختیار کرنے سے کسی مفید نتیجہ کی توقع نہیں ہے۔

چوتھی بنیاد

قرآن حکیم کے بتدریج نزول اور تخصیص وتعمیم کے اصول سے یہ بات ثابت ہے کہ احکام ومسائل میں وقتی ومعاشرتی ضروت ومصلحت کی رعایت ہوتی ہے جیسا کہ قاضی بیضاوی کہتے ہیں:

"**وذلک لان الاحکام شرعت والآیات نزلت لمصالح العباد وتکمیل نفوسهم فضلا من الله ورحمة وذلک یختلف باختلاف الاعصار والاشخاص کاسباب المعاش فان النافع فی عصر واحد یضر فی غیره**"(۲)

(یہ اس لئے کہ اللہ کے فضل ومہربانی سے بندوں کے مصالح اور ان کے نفوس کی تکمیل کے لئے احکام مقرر ہوئے اور آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ یہ مصالح اشخاص اور زمانہ کے لحاظ سے مختلف ہوتے

(۱) بیضاوی ۱۱۔ (۲) ایضا۔

ہیں جیسے معاش کے وسائل وذرائع وغیرہ بسا اوقات ایک زمانہ میں جو چیز نافع ہوتی ہے وہ دوسرے میں مضر ہوتی ہے)

اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کہتے ہیں:

"**والثانی ان یکون شیئ مظنة مصلحة او مفسدة فیحکم علیه حسب ذلک ثم یاتی زمان لا یکون فیه مظنة لها فیتغیر الحکم**"(۱) (نسخ کی دوسری قسم یہ ہے کہ کسی مصلحت کی رعایت یا مفسدہ کے اندیشہ سے کوئی حکم دیا جائے پھر ایسا زمانہ آجائے کہ اس میں یہ مقصود نہ رہے تو وہ حکم بدل جائے گا)

صحابۂ کرامؓ نے اپنے زمانہ میں اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر قرآن حکیم کے بعض جزئیات تک کے عمل کو مؤخر کر دیا تھا اور بعض عموم کو خصوص پر محمول کیا تھا۔ جیسا کہ قحط کے زمانہ میں سرقہ کی سزا اور مؤلفة القلوب وغیرہ کے بارے میں خلافت راشدہ نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا اس سے اہل فکر ونظر بخوبی واقف ہیں۔

صحابہؓ کے طرز عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قانون کے نفاذ میں تدریجی طریقۂ کار اختیار کرنا چاہئے اور حالات وتقاضہ کے لحاظ سے ضرورت ومصلحت کی رعایت کو نظر انداز نہ ہونے دینا چاہئے۔

فقہاء کرام نے مذکورہ رعایت سے فائدہ اٹھا کر استحسان، استصلاح، تبدل احکام بہ تبدل زمان وغیرہ اصول وضع کئے ہیں اور انہیں ماخذ قانون کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔

پانچویں بنیاد

جدید حالات میں بیمہ کا مسئلہ حل کرنے کے لئے استحسان اور استصلاح دونوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔ استحسان کی کئی قسموں میں ایک قسم استحسان ضرورت ہے جس کے ذریعہ معاشی ومعاشرتی زندگی کے بکثرت مسائل حل کئے گئے ہیں۔

(۱) حجة الله البالغة ۱/۱۲۲۔

اس کا استعمال قیاسی مسائل میں ہوتا ہے اور ضرورت و مصلحت کو بنیاد بنا کر مسئلہ کا حل دریافت کیا جاتا ہے۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ بعض مسائل مخصوص حالات و مواقع کی بناء پر مصلحت و ضرورت کے حامل نہیں ہوتے ہیں اور ان پر عمل کرنے سے کہیں دشواری پیدا ہوتی ہے اور کہیں ضرر رساں اور غیر منصفانہ نظر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں الٰہی حکمت کے مطابق انہیں چھوڑنے۔ یا مؤخر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور حصول مصلحت و ضرورت کی خاطر وسعت و فراخی کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔

استحسان میں انہیں ضرورتوں اور مصلحتوں کا لحاظ ہوتا ہے جو الٰہی حکمت کے مطابق ہوتی ہیں اور شارع نے قانون سازی میں انہیں امر و نہی کا پیمانہ بنایا ہوتا ہے۔ ہماری خود ساختہ ضرورت و مصلحت کا اعتبار نہیں ہوتا ہے شارع نے احکام و مسائل میں جن مصلحتوں اور ضرورتوں کا اعتبار کیا ہے ان کی تین قسمیں ہیں (۱) ضروریہ (۲) حاجیہ (۳) تحسینیہ۔

بیمہ کی قسموں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض کا تعلق حاجیہ سے ہے اور بعض کا تحسینیہ سے، چنانچہ دونوں کی تعریف یہ ہے۔

"اما الحاجيات فمعناها انها مفتقر اليها من حيث التوسعة و رفع الضيق المودى فى الغالب الى الحرج والمشقة اللاحقة بفوت المطلوب فاذا لم تراع دخل على المكلفين على الجملة (اى ليس كل المكلفين يدخل عليه الحرج لفقد هذه الحاجيات) الحرج والمشقة ولكنه لا يبلغ مبلغ الفساد العادى المتوقع فى المصالح العامة". (۱)

(مصالح حاجیہ وہ ہیں جن کا لحاظ وسعت و فراخی حاصل کرنے اور اس تنگی کو رفع کرنے کے لئے ہوتا ہے جو اکثر حرج و مشقت تک

(۱) الموافقات مع حاشیہ جزء ثانی ۱۱۔

پہونچاتی ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ سب پر یکساں حالت طاری ہو بلکہ فی الجملہ مکلفین کا حرج و مشقت میں مبتلاء ہونا کافی ہے۔ یہ حرج و مشقت اس نوعیت کا ہو کہ جس کا تعلق مقصود کے فوت ہونے سے ہوتا ہے لیکن اس درجہ کی نہ ہو کہ جس کی رعایت نہ کرنے سے عادۃً مصالح عامہ میں خلل کا اندیشہ ہوتا ہے)

"وفى المعاملات كالقرض والمساقاة والسلم بل سائر المعاملات التى لا يتوقف عليها حفظ النفس وغيرها من الضروريات الخمس" (۱) (معاملات میں ان مصالح کی مثال قرض مساقات بیع سلم بلکہ تمام وہ معاملات ہیں جن پر کلیات خمسہ (دین، نفس، عقل، نسل اور مال) کی حفاظت موقوف نہ ہو (بلکہ اس سے نیچے درجہ کی ہو)

مصالح تحسینیہ وہ ہیں کہ انسان کو دائرہ انسانیت و شرافت میں رہتے ہوئے ان کے بغیرہ چارہ نہ ہو اور جن سے اجتناب عقل سلیم (قلب میں تربیت پائی ہوئی عقل) کے نزدیک ضروری ہو مثلاً عمدہ اخلاق اچھی عادتیں، کھانے پینے کے آداب، معاشی و معاشرتی زندگی میں اعتدال و توازن برقرار رکھنے کے احکام اور ان کی راہ میں جو چیزیں رکاوٹ بنتی ہوں ان کے ازالہ کے قوانین وغیرہ۔ (۲)

مسئلہ کے حل کا دوسرا ذریعہ استصلاح ہے۔ اس میں صرف ضرورت و مصلحت کو بنیاد بنا کر مسئلہ کا حل دریافت کیا جاتا ہے اور استحسان سے زیادہ وسعت و فراخی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

استصلاح سے زیادہ اس شعبہ میں کام لیا جاتا ہے جس کا تعلق معاشرتی فلاح و بہبود سے ہے مثلاً جدید تقاضہ کے مطابق قوانین بنانا، موقع محل کے لحاظ سے ان کے نفاذ کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کرنا اور سزائیں مقرر کرنا وغیرہ۔

(۱) الموافقات مع حاشیہ جزء ثانی ۱۱۔ (۲) ایضا۔

اس کے ذریعہ کبھی ایسا حکم دینے کی بھی گنجائش نکلتی ہے جو کتاب وسنت کے عام حکم کے خلاف ہو، مثلاً اسلام اور کفر کی جنگ میں دشمن نے مسلم قیدیوں کو سامنے کر دیا اور یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر ان مسلموں پر حملہ نہ کیا گیا تو دشمن کی پسپائی ناممکن ہوگی اور وہ غالب آ جائیں گے۔ ایسی حالت میں باوجود اس کے کہ مسلم کا ناحق قتل حرام ہے پھر بھی ان کو تہ تیغ کر کے دشمن پر غلبہ حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

فقہاء نے استصلاح سے فائدہ اٹھانے کی چند شرطیں مقرر کی ہیں جن کی رعایت ضروری ہے مثلاً۔

(۱) ضرورت ومصلحت جس کو بنیاد بنا کر مسئلہ کو حل کیا جا رہا ہے وہ کلیات خمسہ کی ضروریات ومصالح سے مشابہ ہو (کلیات خمسہ دین، نفس، عقل، نسل، مال کی حفاظت)

(۲) قطعی ہو کہ ضرورت ومصلحت کے حصول کا یقین ہو۔

(۳) کلی ہو کہ ملک وملت کے عمومی فائدہ ومصلحت سے اس کا تعلق ہو۔

اصل یہ ہے کہ جن مصالح کا حصول مقصود اور مضرت کا دفعیہ منظور ہو وہ شریعت کے بنیادی اصول اور کلی پالیسی کے خلاف نہ ہوں اگرچہ صراحۃ کہیں ان کا ذکر نہ ہو۔(۱)

ان بنیادوں کے متعین ہونے کے بعد اب زیر بحث مسئلہ کے حل کی اصل صورت پر غور کرنا چاہئے۔

حادثاتی بیمہ کے حل کی صورت

حادثاتی بیمہ کی مشابہت عاقلہ کے نظام سے پائی جاتی ہے جو دور جاہلیت میں رائج تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو برقرار رکھا تھا پھر ضرورت دیت کے پیش نظر خلفاء راشدین نے اس کو مزید تنظیمی شکل دی تھی۔

عاقلہ حادثات وخطرات کی تلافی کے لئے امداد باہمی اور اجتماعی جرمانہ کی ایک

(۱) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر از ص ۱۶۲ تا ۲۷۲۔

شکل تھی جس میں امیر غریب ہم پیشہ وہم مشرب لوگ شریک ہوتے تھے۔

اس کا زیادہ نمایاں تعلق اگرچہ ایک خاص صورت سے تھا کہ کنبہ قبیلہ کے لوگ دیت (خون کی قیمت) کی ادائیگی میں قاتل کی مدد کرتے تھے لیکن فقہ کی کتابوں میں جس انداز سے تذکرہ ہے اس سے مختلف حادثات وخطرات کے وقت اس قسم کے نظام کو بروئے کار لانے کی عمومیت ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ تصریح ہے۔

"وتوجد هذه العادة بين الناس فان من لحقه خسر ان من سرقة او حرق يجمعون له مالا لهذا المعنى" (۱) (یہ عادت لوگوں میں پائی جاتی ہے کہ جس شخص کو چوری یا آگ لگنے سے نقصان پہونچتا ہے اس کی مدد کے لئے لوگ مال جمع کرتے ہیں)

فتاوی عالمگیری میں ہے:

"ان العبرة فى هذا التناصر وقيام البعض بامر البعض" (۲) (دراصل اس میں باہمی امداد اور ایک دوسرے کو سہارا دینے کا اعتبار ہے)

سرخسی کی المبسوط میں ہے:

"وكل احد لا يامن على نفسه ان يبتلى بمثله وعند ذلك يحتاج الى اعانة غيره اذا ابتلى بمثله كما هو العادة بين الناس فى التعاون والتوادد" (۳) (کسی کو بھی یہ اطمینان نہیں ہوتا ہے کہ وہ حادثات وآزمائش میں مبتلاء نہ ہوگا اور ایسی حالت میں وہ دوسروں کی مدد کا محتاج نہ ہوگا جب صورت یہ ہے تو آڑے وقت میں دوسروں کی مدد کرنا چاہئے تاکہ یہ لوگ

(۱) شامی ۵/۵۶۲۔ (۲) عالمگیری ۶/۵۳۔ (۳) المبسوط ۲۷/۱۲۷۔

اس کی وقت پر مدد کریں جیسا کہ لوگوں میں باہمی تعاون ومحبت کی عادت پائی جاتی ہے)

''عاقلہ'' میں اجتماعی جرمانہ کی حیثیت اس عبارت سے واضح ہوتی ہے:

"ان العاقلة يتحملون باعتبار تقصيرهم وتركهم حفظه ومراقبته" (۱) (عاقلہ حفاظت ونگرانی میں کوتاہی کرتے اور اپنی ذمہ داری نہیں محسوس کرتے ہیں اس لئے وہ دیت کا بار برداشت کریں)

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یہ نظام تقریباً اسی طرح چلتا رہا جس طرح زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔لیکن جب بعد میں حالات کی تبدیلی کی وجہ سے معاشرتی زندگی کی نئی تنظیم وتقسیم وجود میں آئی تو حضرت عمرؓ نے اس نظام میں بھی ترمیم واصلاح کی مثلاً:

"والعاقلة اهل الديوان ان كان القاتل من اهل الديوان"(۲) (اگر قاتل اہل دیوان سے ہے تو عاقلہ اہل دیوان ہوں گے)

اہل دیوان میں ایک محکمہ یا ایک دفتر کے لوگ شامل ہوتے تھے جن کے نام ایک رجسٹر میں درج ہوں یا وہ کسی ایک سلسلہ میں منسلک ہوں۔

فاروق اعظم کی اس تبدیلی سے وسعت وفراخی پیدا ہوئی اور دیت کا معاملہ کنبہ کے افراد میں محدود نہ رہا۔علامہ سرخسی اس تبدیلی پر یہ تبصرہ کرتے ہیں:

"ان رسول الله ﷺ قضى به على العشيرة باعتبار النصرة وكان قوة المرء ونصرته يومئذ بعشيرته ثم لما دون عمر الدواوين صارت القوة والنصرة بالديوان"(۳)

(۱) شامی ۵/۵۶۲۔ (۲) ہدایہ ۴/۶۲۹۔ (۳) المبسوط ۲۷/۱۲۷۔

(رسول اللہ ﷺ نے خاندان وقبیلہ پر دیت کی ذمہ داری نصرت کے اعتبار سے ڈالی تھی اور اس وقت اس ذریعہ سے قوت ومدد حاصل ہوتی تھی پھر جب حضرت عمرؓ نے دفاتر کا نظام مرتب کیا تو یہ قوت ومدد دفاتر کے لوگوں سے متعلق ہوگئی)

اس سے ثابت ہوتا ہے اصل اعتبار قوت ومدد کا ہے اگر ہم پیشہ وہم مشرب یا یونین وانجمن کے ذریعہ نظم کے ساتھ قوت ومدد حاصل ہوسکتی ہے تو حالات وتقاضہ کے لحاظ سے سب کی گنجائش ہے۔

"لو كان اليوم تناصرهم بالحرف فعاقلتهم اهل الحرفة" (۱) (اگر آج ہم پیشہ لوگوں سے مدد پہونچ سکتی ہے تو عاقلہ ہم پیشہ قرار پائیں گے)

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں ایک ایسا نظام قائم کرنے کی حوصلہ افزائی موجود ہے کہ جس کے ذریعہ مالی نقصان اور حادثہ کی تلافی کا بندوبست کیا جاسکے۔اور اس میں ہم پیشہ وہم مشرب لوگ یا یونین وانجمن کے ممبر شریک ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ نظام فنڈ کی فراہمی کے بغیر نہیں قائم ہوسکتا ہے اور نہ ایسی کسی صورت کو موجودہ دور میں منظّم کہا جاسکتا ہے جس میں حادثہ پیش آنے کے بعد فنڈ کی فراہمی کا بندوبست کیا جائے۔

لامحالہ اس کے لئے کوئی یونین وانجمن ایسی بنانی پڑے گی جس میں ایک نظم کے تحت فراہمی فنڈ کا انتظام ہو اور وقت ضرورت اس سے کام لیا جاسکے۔

حادثاتی بیمہ کی شکل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی قسم کا ایک نظام ہے جس کے ذریعہ بیمہ دار سے سالانہ ایک رقم وصول کی جاتی ہے اور حادثہ کے وقت ضروری مدد اور قوت پہونچانے کا بندوبست ہوتا ہے۔

(۱) ہدایہ ۴/ایضا۔

اس میں شک نہیں کہ بعض صورتیں کاروباری انداز کی پائی جاتی ہیں اور بعض میں دھوکہ بھی ہوتا ہے مثلاً کمپنی سے زیادہ رقم وصول کرنے کے لئے لوگ کبھی اپنا مال ضائع کردیتے ہیں، یا اس کو نقصان پہونچاتے ہیں اور پھر حسب نقصان کمپنی سے رقم وصول کرتے ہیں۔

اسی طرح حادثہ کی نوعیت کے پیش نظر ایک شخص کبھی ادا کی ہوئی رقم سے زیادہ وصول کرتا ہے اور کبھی کم وصول کر پاتا ہے۔ نیز حادثہ پیش نہ آنے کی صورت میں اس کو بالکلیہ نئی رقم سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ ان سب صورتوں میں بظاہر دوسرے کے مال سے بیجا استفادہ کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے یا بلاسبب اپنے مال سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

لیکن نفس معاملہ کی صحت تسلیم کر لینے کے بعد دھوکہ کی صورت سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے بہت سے معاملات اصلاً درست ہوتے ہیں اور صرف وہ صورتیں اور شکلیں ناجائز قرار پاتی ہیں جن میں دھوکہ دہی پائی جاتی ہے۔

اسی طرح جب اس نظام کو امداد باہمی اور اجتماعی جرمانہ کی شکل تسلیم کیا جائے تو پھر مذکورہ کمی بیشی اور محرومی کے خدشات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔

دراصل بیمہ دار معینہ رقم ادا کر کے ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوتا ہے جس میں پیش آنے والے حادثات وخطرات کی تلافی کا بندوبست ہے نہ اس کو اپنی ادا کی ہوئی رقم سے استفادہ ملحوظ ہوتا ہے اور نہ رقم کی مقدار اور اس سے محرومی کا کوئی سوال ہوتا ہے۔ صرف حادثہ کے وقت امداد کی ضرورت پیش نظر ہوتی ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر وہ اس نظام میں شریک ہوتا ہے۔

امداد باہمی اور اجتماعی جرمانہ کی ایک شکل ''قسامہ'' کے نام سے ملتی ہے، حادثاتی بیمہ میں اس سے بھی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

''قسامہ'' کی صورت یہ تھی کہ جب کسی محلّہ میں لاش پائی جاتی اور قاتل کا پتہ نہ چلتا تو پہلے اہل محلّہ سے پچاس آدمیوں کو طلب کر کے ان سے باقاعدہ معاملہ کی تحقیق وتفتیش

کی جاتی تھی۔ اگر بات نکھر کر سامنے آجاتی اور قاتل کا پتہ چل جاتا تو مزید کدو وکاوش کی ضرورت نہ ہوتی ورنہ محلّہ کے تمام لوگ قتل کے ذمہ دار قرار دئے جاتے اور حصہ رسد کے بہ قدر ہر ایک سے حسب ضابطہ مقتول کی دیت وصول کی جاتی تھی۔ حدیث میں ہے:

''ان رسول اللہ ﷺ اقر القسامة علی ما کانت فی الجاهلية وقضیٰ بها رسول الله بين ناس من الأنصار فی قتيل ادعوه علی اليهود''(۱) (رسول اللہ ﷺ نے قسامہ اسی طرح برقرار رکھا جس طرح زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا چنانچہ خود رسول اللہ نے ایک مقتول کے بارے میں اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا تھا جبکہ انصاریوں نے یہودیوں پر دعویٰ کیا تھا)

فقہاء نے قسامہ کی جو حکمت بیان کی ہے اس سے اجتماعی جرمانہ کی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے:

''قسامہ کا مقصد یہ ہے کہ اس سے قاتل کا پتہ چل جائے اور اہل محلّہ حفاظت کے معاملہ میں اپنی ذمہ داری محسوس کریں گویا اس قسم کا حادثہ ان کی کوتاہی سے پیش آیا ہے کیونکہ لوگوں کی حفاظت اور غنڈوں کی نگرانی ان کے ذمہ تھی''(۲)

غرض امداد باہمی اور اجتماعی جرمانہ کی مختلف شکلوں کا ثبوت اسلام میں موجود ہے جن کے ذریعہ بحری بیمہ، آگ کے بیمہ اور جائداد کے بیمہ کو حل کیا جاسکتا ہے۔

جائداد اور ذمہ داری کے بیمہ کے حل کی صورت

شخصی اور ذمہ داری کے بیمہ کو حل کرنے کے لئے زیادہ موزون صورت ''عقد موالاۃ'' کی ہے۔

---

(۱) مسلم شریف، رقم الحدیث: ۱۶۷۰۔

(۲) المبسوط ۲۶/۱۰۸۔

زمانۂ جاہلیت میں عقد موالاۃ کی صورت باہمی معاہدہ کی تھی جس کے ذریعہ ایک شخص دوسرے کی ذمہ داری قبول کرتا تھا اور مرنے کی بعد (جبکہ ورثاء نہ ہوں) یہی شخص اس کی وراثت کا مستحق قرار پاتا تھا۔

اسلام نے حسب دستور افادیت کے پیش نظر اس صورت کو برقرار رکھا اور معاہدہ کے ذریعہ قائم شدہ قانونی اور حقوقی روابط کو تسلیم کیا۔ قرآن حکیم کی اس آیت میں عقد موالاۃ کا ذکر ہے:

"**والذین عقدت ایمانکم فآتوھم نصیبھم**" (۱) (اور جن لوگوں نے تم سے معاہدہ کیا ہے ان کا حصہ دو)

حدیث میں یہ روایت ہے:

"**قال سألت رسول الله ﷺ عن الرجل یسلم علی یدی الرجل ما السنة فیه قال ھو اولی الناس بمحیاہ ومماته واید ھذا قوله تعالیٰ والذین عقدت ایمانکم**"(۲)

(تمیم داری کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ جو شخص کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے آپ نے فرمایا کہ جس کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے وہی اس کی زندگی اور موت میں قریبی مددگار ہے تائید کے لئے رسول اللہ نے آیت **والذین عقدت ایمانکم** پڑھی)(۳)

"عقد موالاۃ" کو بروئے کار لانے کے لئے کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا شرط نہیں ہے:

"**والاسلام علی یدیه لیس بشرط لعقد الموالاۃ وانما ذکرہ علی سبیل العادۃ**"(۴) (عقد موالاۃ کے لئے کسی کے

(۱) سورہ نساء:۳۳۔ (۲) ابوداؤد(۲۹۱۸)۔ (۳) المبسوط ۹۱/۸۔
(۴) المبسوط ۹۱/۸۔

ہاتھ پر اسلام قبول کرنا شرط نہیں ہے رسول اللہ نے اس کو برسبیل عادت فرمایا ہے)

علامہ سرخسیؒ کہتے ہیں:

"زمانہ جاہلیت میں لوگ چند طریقوں سے باہمی مدد کرتے تھے ان میں سے ایک طریقہ حلف کے ساتھ باہمی معاہدہ کا تھا۔ شریعت نے نصرت ومحبت کے ساتھ باہمی تعاون کے سلسلہ کو برقرار رکھا اور حضور ﷺ نے فرمایا "**مولی القوم من انفسھم وحلیفھم منھم**" (قوم کا مولی اور انکا حلیف انہیں میں سے سمجھا جائے گا) چونکہ اس معاہدہ میں باہمی تعاون پایا جاتا ہے اس لئے شریعت نے نہ صرف اس کو برقرار رکھا بلکہ وراثت کی بنیاد تسلیم کیا"۔(۱)

ایک اور جگہ لکھا:

"**لانه لیس فیه معنی المعاوضة بل احدھما متبرع علی صاحبه بالقیام علی نصرته وعقل جنایته والاخر متبرع علی صاحبه فی جعله ایاہ خلیفته فی ماله بعد وفاته**"(۲)

(عقد موالاۃ میں معاوضہ کے معنی نہیں پائے جاتے ہیں بلکہ ان میں سے بہ طور تبرع دوسرے کی مدد کرتا ہے اس کی جنایت کی دیت ادا کرتا ہے اور دوسرا پہلے پر یہ تبرع کرتا ہے کہ اپنی وفات کے بعد اپنے مال میں اس کو خلیفہ بناتا ہے)

عرب میں ذمہ داری قبول کرنے کے بعد بھی کئی شکلیں رائج تھیں ہدایہ میں ہے:

(۱) المبسوط ۸۱/۸۔ (۲) ایضا ۹۳۔

"وکانت العرب تتناصر باشیاء (کالنسب والولاء والحلف وغیرہ)" [1] (اہل عرب چند چیزوں کے ذریعہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے نسب، کسی گروہ میں شامل ہوجانا اور مدد کا معاہدہ کرلینا وغیرہ)

دراصل عرب میں خطرات سے حفاظت وضمانت کے لئے امداد باہمی کی مختلف شکلیں مختلف حالات کے لئے رائج تھیں کوئی کسی میں شریک ہوتا تھا اور کوئی کسی کے ذریعہ اپنا کام نکالتا تھا۔

چونکہ ان شکلوں کے رواج پانے کے اسباب ومحرکات موجود تھے اور لوگوں کی ضرورتیں ان سے وابستہ تھیں اس بناء پر اسلام نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ اور تقویت پہونچائی۔

''عقد موالاۃ'' میں جس طرح ایک شخص دوسرے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور دوسرا اپنے مال میں (وفات کے بعد) اس کو خلیفہ بناتا ہے۔ اسی طرح شخصی اور ذمہ داری کے بیمہ میں ایک شخص معینہ رقم کمپنی کو ادا کرتا ہے اور کمپنی ''اکسیڈنٹ'' کے وقت اس کے دوا دارو کا انتظام کرتی ہے یا ذمہ داری کے بیمہ میں کمپنی بچوں کی تعلیم وغیرہ کا ذمہ لے کر صرفہ برداشت کرتی ہے۔

یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ مسئلہ بیمہ کے حل کی مذکورہ صورتوں سے انہیں کا حل تلاش کرنا صحیح ہوگا جن کی قوم وملت کو ضرورت ہے اور جن کے بغیر قومی ضرر کا یقین ہے معاشرہ واجتماع کی نمو بخش فضاء پر اثر پڑتا ہے مثلاً موجودہ دور میں بحری بیمہ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر بیرونی ممالک سے بحفاظت مال درآمد کرنے کی اور کوئی شکل نہیں ہے۔ آگ کے بیمہ اور حادثاتی بیمہ کی اس لئے ضرورت ہے کہ نہ نقصان کی تلافی کا کوئی بندوبست ہے اور نہ امداد باہمی کا کوئی ادارہ ہے کہ اس کے ذریعہ آڑے وقت میں امداد کی

(۱) ہدایہ، کتاب الولاء (۴۰۲)۔

کوئی سبیل نکل سکے۔

حکومتیں اپنے تمام تر دعووں کے باوجود عملاً کوئی ایسی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ان پر انسان کی بنیادی ضرورتوں کی حد تک ہی اعتماد کیا جاسکے اور ان کے ذریعہ حادثہ ونقصان کے مارے ہوئے شخص کو سنبھالنے کی شکل پیدا کی جائے۔

شخصی اور ذمہ داری کا بیمہ اس لئے ضروری ہے کہ موجودہ دور کا انسان کچھ اس انداز سے زندگی گذار رہا ہے کہ جب تک پس اندازی کی کوئی معقول صورت نہ ہو نہ دوادارو کا ٹھیک انتظام ہو پاتا ہے اور نہ بچوں کی تعلیم وغیرہ کا بندوبست ہوتا ہے جس کی بناء پر معاشرہ واجتماع کی نمو بخش فضاء پر اثر پڑنا لازمی ہے۔

ایسی حالت میں شریعت کی وسعت وفراخی (بشرطیکہ گنجائش ہو) سے کام نہ لیا جائے گا اور قوم وملت کو سنبھالنے کی کوشش نہ ہوگی تو بقاء وارتقاء کی منزلیں تقریباً ناممکن بن جائیں گی۔ لیکن وسعت وگنجائش میں اس بات کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اسلام کا ایک خاص مزاج ہے جو اس کی تعلیمات وتنقیحات سے سمجھا جاتا ہے ضرورت فائدہ اور نقصان کے فیصلہ میں اس مزاج کی رعایت ضرورت ہے۔

بیمہ میں وسعت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ صورتیں بھی جائز قرار دے دی جائیں جو محض تعیش اور حرص وہوس کی تسکین کے لئے وضع ہوئی ہیں مثلاً بعض ممالک میں حسن وجمال اور راگ راگنی وغیرہ کا بیمہ ہوتا ہے اسی طرح سیاسی لیڈر کا میابی وناکامی کی بنیاد پر الیکشن کا بیمہ کراتے ہیں وغیرہ۔

بیمۂ زندگی کے حل کی صورت:۔

بیمہ کی قسموں میں سب سے زیادہ مشکل زندگی کا بیمہ سمجھا جاتا ہے اس میں شرعی نقطۂ نظر سے بعض ایسی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں جن پر قابو پانا بظاہر دشوار معلوم ہوتا ہے اس بناء پر عمل کی صورت سے پہلے اس کا تحریر کرنا اور موجودہ ومستقبل کی اصل شراکت کو واضح کرنا ضروری ہے۔

بیمہ زندگی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل مال ہی کا بیمہ ہے جو ایک خاص انداز سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس کی وجہ سے بڑی حد تک اس کی نوعیت مختلف ہوگئی ہے۔ چونکہ طے شدہ رقم کی ادائیگی کی مدت طویل ہوتی ہے اور زندہ رہنے کے تقاضوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ معاملہ طے پاتا ہے اس بناء پر اس کو زندگی کا بیمہ کہا جاتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جس بات کا تعلق انسان کے دائرۂ اختیار سے باہر محض قدرت خداوندی سے ہو اس میں اندازہ وقیاس کی کیا اہمیت ہوسکتی ہے۔ چنانچہ بیمہ میں اکثر وبیشتر ڈاکٹر کے معائنہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور اندازہ سے پہلے بیمہ دار کی موت واقع ہوجاتی ہے۔

اس اندازہ کو بنیاد بنا کر معاملہ طے کرنا بیمہ کمپنی یا لائف انشورنس کارپوریشن کی غلطی ہے اسی طرح اس کو بنیاد بنا کر مسئلہ کا حل تلاش کرنا بھی کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ جس بنیاد کی واقعاتی دنیا میں کوئی پائدار بنیاد نہ ہو وہ محض فرضی ہوگی اور اس کو جواز یا عدم جواز کی بنیاد تسلیم کرلینا ایک فرضی بنیاد پر عمارت تعمیر کرنے کے مرادف سمجھا جائے گا۔

موجودہ دور میں جس قسم کے مختلف الجہات مسائل پیدا ہوگئے ہیں وہ پہلے زمانہ میں نہ تھے پھر مسائل کی ترتیب وتنظیم اور بروئے کار لانے میں خیر کے ساتھ شر کی جیسی آمیزش ہوگئی ہے اس سے خیر کو بے داغ نکالنا بھی تقریباً ناممکن بن گیا ہے۔ اس بناء پر بیمہ سے متعلق مختلف الجہات مسائل کو فقہاء کے لئے چھوڑ دینا اور فقہاء کا کسی سمت کا متعین کرنا دشوار گزار کام ہے، اور حل کی صورت نکالنے میں بہمہ وجوہ شر سے اجتناب کا دعویٰ بھی بے معنی ہے۔

بہتر صورت یہ ہے کہ جس طرح بیع الوفاء میں لوگوں کی ضرورت ومصلحت کا لحاظ کرکے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کردیا گیا تھا یہی طریقۂ کار بیمہ زندگی میں بھی اختیار کیا جائے۔

پھر جو بات احتیاط اور دیانت سے زیادہ قریب ہو اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اور اگر ضرورت ومصلحت کو نظر انداز کرکے حسب دستور خیال آرائیوں اور نکتہ

سنجیوں میں دین ومذہب کی سب سے بڑی خدمت سمجھی جاتی رہی تو نئے پیدا شدہ مسائل میں کسی مسئلہ کے حل کی توقع نہ رکھنا چاہئے۔

''بیمہ'' کو جن چند ابواب سے متعلق کرکے دیکھا جاسکتا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) باب الامانۃ

(۲) باب الکفالۃ

(۳) باب المضاربۃ

ہر ایک کی تفصیل درجہ ذیل ہے۔

امانت سے متعلق کیا جائے

''باب الامانۃ'' بیمہ دار کمپنی کو قسط وار جو رقم ادا کرتا رہتا ہے وہ بطور امانت قرار دی جائے اور کمپنی کو بحیثیت ''امین'' اس پر قابض تسلیم کیا جائے۔ اس صورت میں یہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

(۱) ''امین'' مال امانت میں تصرف کرنے کا مجاز نہیں ہے لیکن بیمہ کمپنی زر بیمہ میں آزادانہ ہر قسم کا تصرف کرتی ہے۔

(۲) مال امانت تلف ہوجانے کی صورت میں (جبکہ حفاظت میں کوتاہی نہ ہوئی ہو) امین پر تاوان واجب نہیں ہے لیکن کمپنی زر بیمہ کی واپسی کا بہرصورت وعدہ کرتی ہے۔

(۳) دو چار قسطوں کی ادائیگی کے بعد اگر زر بیمہ کی ادائیگی بند کردی جائے تو ادا شدہ رقم سوخت ہوجاتی ہے حالانکہ مال امانت جتنا دیا گیا ہے اس کی واپسی ضروری ہے۔

(۴) مدت مقررہ سے پہلے بیمہ دار کا انتقال ہوجائے تو طے شدہ پوری رقم ورثاء کو دی جاتی ہے حالانکہ امانت میں جتنی رقم دی گئی ہے اس سے زیادہ لینا درست نہیں ہے۔

(۵) کمپنی جائز وناجائز ہر قسم کے تصرفات کی مجاز ہوتی ہے جو شرعاً درست نہیں ہے۔

(٦) وقت مقررہ پر اصل ادا شدہ رقم مع سود کے حوالہ کی جاتی ہے جس کی

شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ترتیب وار ہر ایک کے جوابات ذکر کئے جاتے ہیں۔

(۱) امین کو مالک کی اجازت سے مال امانت میں تصرف کا حق حاصل ہے معاہدۂ بیمہ کے ذریعہ یہ حق کمپنی کو حاصل ہو جاتا ہے۔

"وان باذنه اشتركا شركة املاك"(۱) (امین اگر مالک کی اجازت سے اپنے مال میں امانت کو شامل کر لے تو دونوں میں ملکیت کی شرکت ہو جائے گی)

امین کو مالک کی اجازت سے جس طرح اپنے مال میں شامل کرنے کا حق ہے اسی طرح اجازت سے مال امانت میں تصرف کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔

شرکت املاک کا حکم یہ ہے:

"ان هلك هلك من مالهما جميعا ويُقسم الباقي على قدر ما كان لكل واحد منهما كالمال المشترك" (۲) (اگر مال امانت تلف ہو گیا تو امین اور مالک دونوں کا مال تلف ہوگا اور بقیہ مال دونوں کے درمیان مال مشترک کی طرح بقدر حصہ تقسیم کر دیا جائے گا)

بیمہ میں شرکت املاک نہیں بن سکتی ہے کیونکہ کمپنی زر بیمہ کی مالک نہیں قرار پاتی ہے بلکہ معاہدۂ بیمہ کے ذریعہ وہ قابض اور متصرف ہوتی ہے۔

(۲) مال امانت تلف ہو جانے کی صورت میں ضمان کا عدم وجوب قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ باب امانت میں بہت سی صورتیں ضمان کی موجود ہیں مثلاً:

"وكذا لو خلطها المودع بجنسها او بغيره بماله او مال آخر بغير اذن المالك بحيث لا تتميز الا

(۱) درالمختار از حاشیہ ردالمحتار ۶۸۵۔ (۲) شامی ۴/۶۸۵۔

بكلفة" (۱) (اگر امین نے مال امانت کو اسی کی جنس یا دوسری جنس کے اپنے مال یا دوسرے کے مال کے ساتھ مالک کی اجازت کے بغیر اس طرح شامل کر لیا کہ دونوں میں آسانی کے ساتھ امتیاز نہیں ہو سکتا ہے تو ضمان دینا پڑے گا)

معاہدۂ بیمہ کے تحت اگرچہ دوسرے اموال کے ساتھ زر بیمہ کو شامل کرنے کی اجازت ہوتی ہے لیکن کمپنی جائز و ناجائز تصرفات میں جس طرح آزاد ہوتی ہے اس کی اجازت بیمہ دار کی طرف سے نہیں تسلیم کی جا سکتی ہے اس بناء پر ضمان کی صورت بدستور باقی رہتی ہے۔

تلف کی صورت میں ضمان کی یہ صورت بھی موجود ہے۔

"فان طلبها صاحبها فمنعها وهو يقدر على تسليمها ضمنها"(۲) (اگر مالک نے اپنا مال طلب کیا اور قدرت کے باوجود امین نے نہ واپس کیا تو ضمان واجب ہوگا)

بیمہ میں رقم کی واپسی عند الطلب نہیں ہوتی ہے بلکہ حسب قاعدہ وقت مقررہ پر ہوتی ہے۔ اس بناء پر ضمان کی صورت باقی رہ سکتی ہے۔ اجرت کے عوض مال امانت رکھا جائے تو تلف کی صورت میں ضمان واجب ہوتا ہے۔

"فلا يضمن بالهلاك الا اذا كانت الوديعة باجر" (۳) (جب امانت اجرت کے بدلہ ہو تو تلف سے ضمان واجب ہوگا)

(۳) اور (۴) کے جواب کے لئے وسیع نقطۂ نظر سے اجتماعی اداروں میں غور کرنے کی ضرورت ہے مثلاً اوپر بتایا جا چکا ہے کہ "بیمہ" دراصل امداد باہمی کا اجتماعی ادارہ ہے جس میں مستقبل کے غیر متوقع خطرات کے انسداد اور ناگہانی نقصان کی تلافی کا بندوبست ہے۔

اس ادارہ میں بلا شبہ کاروبار کی شکل پائی جاتی ہے اور اس کی ترتیب و تنظیم میں

(۱) ردالمختار از ردالمحتار ۴/۶۸۵۔ (۲) ہدایہ ۲۲۶۔ (۳) شامی ۶۸۱۔

اسلامی قواعد کی رعایت نہیں ملحوظ ہے۔لیکن عرصہ سے مسلم معاشرہ اوراس کے رہنما جس انداز سے زندگی گذار رہے ہیں ان سے توقع نہیں ہے کہ وہ اسلامی قواعد کے مطابق کوئی ادارہ قائم کرسکیں گے کہ جس کے ذریعہ بیمہ کے فوائد احتیاط اور تقویٰ کے ساتھ حاصل کئے جائیں۔

ادھر مسلم معاشرہ کی احتیاج دن بدن بڑھتی جارہی ہے اور امداد باہمی کی کوئی تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات موت وحیات کی کشمکش تک نوبت پہونچتی ہے ورنہ عام حالات میں معاشرہ کے نموبخش فضاء پر اثر سے کسی طرح انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ایسی حالت میں جب تک وسیع نقطۂ نظر سے مروجہ قابل عمل صورتوں میں غور نہ کیا جائے گا محض خیالی باتوں اور ناقابل عمل بحثوں سے کسی نتیجہ کی توقع نہیں ہے۔

امداد باہمی کے اداروں میں بالعموم اجتماعی مفاد کو تقدم حاصل ہوتا ہے اور فائدہ اٹھانے کی صورت میں یکسانیت نہیں برقرار رہتی ہے لیکن محض اس بناء پر کسی ادارہ میں شرکت کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ نہیں کیا جاتا ہے۔فرض کیجئے اسلامی قواعد کے مطابق سو آدمیوں کی ایک انجمن اس غرض سے بنائی جائے کہ ان میں کسی پر کوئی مصیبت آئے گی تو سب مل کر اس کی مدد کریں گے اور کسی کا مالی نقصان ہوگا تو اس کی تلافی کی جائے گی۔

انجمن کے ہر ممبر سے مقررہ رقم وصول کر کے طے شدہ پروگرام کے مطابق کسی نفع بخش تجارت میں لگادی جائے اور اس کے منافع سے وقت ضرورت ممبروں کی امداد کی جاتی رہے۔یہ معاملہ شرعی لحاظ سے جائز ہونے کے باوجود ہر ممبر کو یکساں امداد کی ضرورت ہوگی اور نہ سب کے لئے یکساں فائدہ اٹھانے کی صورت بن سکے گی بلکہ ہر ایک کی مصیبت اور مالی خسارہ کی نوعیت کے لحاظ سے امداد کی شکلوں اور مقدار میں نمایاں فرق ہوگا اور بعض ممبران ایسے ہی ہوں گے جن کو امداد کی ضرورت نہ ہوگی یا امداد کی رقم کم اور ادا شدہ رقم زیادہ ہوگی۔

یا مثلاً امداد باہمی اور اجتماعی جرمانہ کے لئے ایک تنظیم کے طرز پر قائم کی جائے عاقلہ نظام اور چندہ کے ذریعہ فنڈ کی فراہمی کرلی جائے تاکہ وقت ضرورت کام آئے اور فوری طور پر کسی پریشانی سے دوچار نہ ہونا پڑے نیز نظام عاقلہ کا دائرہ کار حسب سابق محدود

رکھا جائے اور صرف دیت (خون کی قیمت) کی ادائیگی میں قاتل کے ذریعہ عاقلہ کی مدد کی جایا کرے۔

ظاہر ہے کہ اس نظام سے بھی فائدہ اٹھانے والوں میں یکسانیت نہ برقرار رہے گی بلکہ متعلقہ لوگوں میں سے ہر فرد کے چندہ کے باوجود صرف وہی شخص فائدہ اٹھا سکے گا جو قاتل ہو اور اس کے ذمہ مقتول کی دیت واجب ہو۔

غرض امداد باہمی کے اداروں میں بالعموم اجتماعی مقصد پیش نظر ہوتا ہے اور اسی کو ملحوظ رکھ کر انتفاع میں عدم یکسانیت اور کسی فرد کے نقصان وخسارہ کو برداشت کیا جاتا رہتا ہے۔

بیمہ کی ترتیب وتنظیم میں اسلامی قواعد کی رعایت نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ ان اداروں کے ساتھ اس کو بہمہ وجوہ مشابہت نہیں دی جاسکتی ہے لیکن چونکہ اس میں امداد باہمی اور غیر متوقع حادثات وخطرات کی تلافی کا زیادہ حصہ موجود ہے اس بناء پر انتفاع اور خسارہ کی عدم یکسانیت کو ضرورت اور مصلحت کی بنیاد پر نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

اگر ایک شخص کا انفرادی سرمایہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی وجہ سے سوخت ہوجاتا ہے تو دوسرے کے ورثاء کو (جبکہ بیمہ دار کا مدت مقررہ سے پہلے انتقال ہوجائے) زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔جس شخص کا سرمایہ سوخت ہوتا ہے وہ اپنی زندگی میں اس کا بدل فراہم کرسکتا ہے لیکن جس شخص کا انتقال ہوگیا ہے اس کی آمدنی کا سلسلہ بند ہوجانے کی وجہ سے ورثاء زیادہ مستحق ہوتے ہیں کہ ان کی امداد واعانت کی جائے۔

کمپنی کے پاس اس امداد کے ذرائع اگرچہ دوسرے (تجارت وغیرہ سے نفع) بھی ہوتے ہیں لیکن سوخت شدہ سرمایہ کی رقم بھی اس میں شامل ہوتی ہے اس طرح اگر ایک کو خسارہ (خود کے قصور کی وجہ سے) برداشت کرنا پڑتا ہے تو اس کے ذریعہ زیادہ مستحق کی امداد واعانت کا سامان ہوجاتا ہے۔

(۵) ایسے مواقع پر بالعموم غلبہ کا اعتبار کیا جاتا ہے جائز وناجائز تصرف اور آمدنی میں جس کو غلبہ ہوگا اسی کو بنیاد بنا کر جواز اور عدم جواز کا فیصلہ ہوگا۔

"لان اموال الناس لا تخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب"(۱) (لوگوں کے اموال میں تھوڑے حرام کی آمیزش ہوتی ہی ہے ایسی حالت میں غلبہ معتبر ہوگا)

کمپنی کی آمدنی میں سود کا لین دین شامل ہے لیکن تجارت اور کرایہ وغیرہ سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ مقابلۃً زیادہ ہوتی ہے۔

(۶) اس صورت میں اصل رقم کے ساتھ سود لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے

کفالت سے متعلق کیا جائے

باب الکفالۃ: بیمہ کو کفالت سے متعلق کر کے دیکھا جائے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

"و کفلها زکریا (آل عمران:۳۷)" (حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت مریمؑ کا کفیل بنایا)

اس میں حضرت مریمؑ کے مصالح کی ضمانت مراد ہے۔

"جعله کافلا لها و ضامنا لمصالحها"(۲)

دوسری جگہ ہے:

"ولمن جاء به حمل بعير وانا به زعيم (يوسف)" (جو شخص گم شدہ پیالہ کو لائے گا اس کو اونٹ کا ایک بوجھ دیا جائے گا اور میں اس کا ضامن ہوں)

اس میں مستقبل کے خطرات کی ضمانت ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کفالت کا معاملہ مکفول بہ (حمل) کی جہالت کے ساتھ درست ہے نیز کفالت کو شرط پر معلق کرنا صحیح ہے۔(۳)

بیمہ کو کفالت کی جن بعض صورتوں کے ساتھ ایک گونہ مشابہت ہے یہ ہیں:

(۱) ضمان درک

(۱) عالمگیری ۳۴۲/۵۔ (۲) حاشیہ ہدایہ کتاب الکفالہ ۹۵۔ (۳) حوالہ بالا ۱۰۱۔

(۲) ضمان خطر الطریق

''ضمان درک'' کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ کرنے کے بعد جو نقصان پیش آنے والا ہو اس کی ضمانت لی جائے۔ مثلاً کوئی شخص کہے۔

"تكفلت عنه بما يدركك في هذا البيع" (۱) (میں ضامن ہوں اس نقصان کا جو اس بیع میں تجھکو پہونچے)

اس صورت میں مستقبل کے خطرہ کی ضمانت پائی جاتی ہے اور اس کی صحت پر فقہاء کا اجماع نقل کیا گیا ہے۔ لیکن بیمہ کو اس پر قیاس کرنے میں یہ دشواری ہے کہ مکفول عنہ (مدعی علیہ) کی جہالت کے ساتھ کفالت کا معاملہ درست نہیں ہے ضمان درک میں مکفول عنہ متعین ہے اور بیمہ میں متعین نہیں ہے۔ فقہ میں ہے:

"ولا تصح ايضا بجهالة المكفول عنه في تعليق واضافة لا تخيير" (۲) (تعلیق اور اضافت میں مکفول عنہ کی جہالت کے ساتھ کفالت صحیح نہیں ہے تخییر (یا شامی کے قول کے مطابق تنجیز) میں صحیح ہے)

اس کی وجہ بیان کی گئی ہے اس سے مذکورہ اعتراض کے جواب پر کسی حد تک روشنی پڑتی ہے:

"ووجه جواز جهالة المكفول عنه في التنجيز دون التعليق ان القياس يابى جواز اضافة الكفالة لانها تملك في حق الطالب وانما جوزت استحسانا للتعامل والتعامل فيما اذا كان المكفول عنه معلوما فبقي المجهول على القياس" (۳)

(۱) ہدایہ باب الکفالہ ۸۸۔ (۲) درالمختار از حاشیہ ردالمحتار۔

(۳) (۱) شامی کتاب الکفالۃ۔

(تجہیز میں مکفول عنہ کی جہالت جائز ہے اور تعلیق میں جائز نہیں ہے، کفالت چونکہ طالب کے حق میں ٹھیک ہے قیاساً کفالت کی اضافت جائز نہ ہونی چاہئے لیکن عمل درآمد کی بناء پر استحساناً اس کو جائز رکھا گیا ہے اور عمل درآمد اس صورت میں ہے جبکہ مکفول عنہ معلوم ہو اور اگر وہ مجہول ہے تو قیاس اسی جگہ برقرار رہے گا)

اصل فیصلہ عمل درآمد پر ہے اگر عمل درآمد مکفول عنہ کی جہالت کی صورت میں بھی ہو جائے تو استحساناً یہ صورت بھی جائز ہونی چاہئے۔

(۲) ضمان خطر الطریق

صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کہے۔

"اسلک هذا الطریق فانه آمن فسلک و اخذ ماله لم یضمن ولو قال ان کان مخوفا و اخذ مالک فانا ضامن ضمن"(۱)

(یہ راستہ جاؤ اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے وہ گیا اور اس کا مال لے لیا گیا تو کہنے والا ضامن نہ ہوگا اور اگر یہ کہا کہ راستہ پر خطر ہو اور تمہارا مال لے لیا جائے تو میں ضامن ہوں تو ضمان دینا پڑے گا)

اس میں مکفول عنہ مجہول ہے پھر بھی وہ دھوکہ پائے جانے کی وجہ سے فقہاء نے اس کو جائز کہا ہے جس طرح ضمان درک میں معاملہ کے بعد پیش آنے والے نقصان کی ضمانت لی جاتی ہے اسی طرح بیمہ میں رقم کی حفاظت کا معاملہ کرنے کے بعد مالی نقصان کی تلافی کی ضمانت ہوتی ہے۔ اور جس طرح ضمان خطر الطریق میں راہ پر خطر ہونے کی وجہ سے مستقبل کے خطرہ کی ضمانت ہے اسی طرح بیمہ میں مستقبل کے مختلف خطرات سے نقصان کی ضمانت ہے۔

(۱) شامی کتاب الکفالۃ ۳۴۵۔

باقی اعتراض (۳) اور (۵) کے وہی جوابات ہیں جو باب الامانۃ میں گذر چکے ہیں اور اعتراض (۴) اس بناء پر نہیں وارد ہوتا ہے کہ موت کی وجہ سے آمدنی میں جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کا پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا اب اگر چند قسطوں کی ادائیگی کے بعد بیمہ دار کا انتقال ہو جاتا ہے تو معاہدہ کے مطابق بیمہ کمپنی آمدنی کے نقصان کی تلافی کرتی ہے اور طے شدہ پوری رقم ادا کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس صورت میں بھی اصل رقم کے ساتھ سود کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مضاربت سے متعلق کیا جائے

باب المضاربۃ: بیمہ کو تجارت کا معاملہ قرار دے کر مضاربت سے اس کو متعلق کیا جائے جیسا کہ موسیٰ جار اللہ کی رائے پہلے گذر چکی ہے اس صورت میں اول تو مضاربت کی شرطیں بیمہ میں نہیں پائی جاتی ہیں پھر مذکورہ اعتراض کے جوابات کی بھی کوئی شکل نہیں نکلتی ہے۔

●●●

سوال نامہ متعلق انشورنس

مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلویؒ کنوینر مجلس تحقیقات شرعیہ، لکھنؤ

تمہید

حامداً مصلیاً

بیمہ کی حقیقت

''بیمہ'' انگریزی لفظ ''انشور'' (Insure) کا ترجمہ ہے جس کے معنی لغۃً یقین دہانی کے ہیں، چونکہ کمپنی بیمہ کرانے والے کو مستقبل کے بعض خطرات سے حفاظت اور بعض نقصانات کی تلافی کی یقین دہائی کر دیتی ہے، اس لئے اسے انشورنس کمپنی کہتے ہیں، یہ ایک معاملہ ہے جو بیمہ کے طالب اور بیمہ کمپنی کے درمیان ہوتا ہے اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بیمہ کمپنی (جس میں بہت سے سرمایہ دار شریک ہوتے ہیں اسی طرح جس طرح تجارتی کمپنیاں ہوتی ہیں) بیمہ کے طالب سے ایک معینہ رقم بالاقساط وصول کرتی رہتی ہے، اور ایک معینہ مدت کے بعد وہ رقم اسے یا اس کے پس ماندگان کو (حسب شرائط) واپس کر دیتی ہے، اس کے ساتھ ایک مقررہ شرح فیصد کے حساب سے اصل رقم کے ساتھ کچھ مزید رقم بطور سود دیتی ہے، گو اس رقم کا نام ان کی اصطلاح میں ربوا یا سود نہیں بلکہ بونس یعنی منافع ہے۔

۲۔ کمپنی کا مقصد اس رقم کو جمع کرنے سے یہ ہوتا ہے کہ اسے دوسرے لوگوں کو بطور قرض دے کر ان سے اعلی شرح پر سود حاصل کرے یا کسی تجارت میں لگا کر، یا کوئی جائداد خرید کر اس سے منافع حاصل کرے، اس کے شرکاء اپنی ذاتی رقم خرچ کئے بغیر کثیر رقم

بصورت سود یا منافع حاصل کرتے ہیں، اور اسی سود یا منافع میں سے بیمہ دار کو ایک حصہ دیتے ہیں۔

ممکن ہے کسی درجہ میں ان لوگوں کا مقصد مصیبت زدہ یا پریشان حال افراد کی امداد بھی ہو، لیکن اصل مقصد وہی ہوتا ہے جو اوپر عرض کیا گیا ہے، مگر اس کی بحث بے ضرورت ہے، اس لئے کہ اس کا کوئی اثر نفس مسئلہ پر نہیں پڑتا ہے، بیمہ کرانے والے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کا سرمایہ محفوظ رہے اور اس میں اضافہ بھی ہو اس کے علاوہ اس کے پسماندگان کو امداد و اعانت حاصل ہو، یا ناگہانی حادثات کی صورت میں اس کے نقصان کی تلافی ہو جائے۔

۳۔ بیمہ کی تین قسمیں ہیں

(الف) زندگی کا بیمہ۔

(ب) املاک کا بیمہ۔

(ج) ذمہ داری کا بیمہ۔

الف: زندگی کا بیمہ: اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بیمہ کمپنی اپنے ڈاکٹر کے ذریعہ سے بیمہ کے طالب کا معائنہ کراتی ہے اور ڈاکٹر اس کی جسمانی حالت دیکھ کر اندازہ کرتا ہے کہ، اگر کوئی ناگہانی آفت پیش نہ آئی تو یہ شخص اتنے سال مثلاً بیس سال زندہ رہ سکتا ہے، ڈاکٹر کی رپورٹ پر کمپنی بیس سال کے لئے اس کی زندگی کا بیمہ کر لیتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بیمہ کے لئے ایک رقم مابین طالب و کمپنی مقرر ہو جاتی ہے جو بالاقساط بیمہ دار کمپنی کو ادا کرتا ہے، اور ایک معینہ مدت میں جب وہ پوری رقم ادا کر دیتا ہے، تو بیمہ مکمل ہو جاتا ہے، اب اس کے بعد اگر بیمہ دار اتنی مدت کے بعد انتقال کر جاتا ہے، جس کا اندازہ کمپنی کے ڈاکٹر نے کیا تھا تو کمپنی اس کے پس ماندگان میں سے جسے وہ نامزد کر دے، یا اگر نامزد نہ کرے تو اس کے قانونی ورثاء کو وہ جمع شدہ رقم مع کچھ مزید کے جس کو بونس (Bonus) کہتے ہیں یکمشت ادا کر دیتی ہے۔

اور اگر وہ مدت مذکورہ سے پہلے مرجائے خواہ طبعی موت سے، یا کسی حادثہ وغیرہ سے، تو بھی کمپنی اس کے پس ماندگان کو حسب تفصیل مذکور پوری رقم مع کچھ زائد رقم کے ادا کرتی ہے، مگر اس صورت میں شرح منافع زائد ہوتی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ وہ شخص مدت مذکورہ کے بعد بھی زندہ رہے، اس شکل میں بھی اسے رقم مع منافع واپس ملتی ہے، مگر شرح منافع کم ہوتی ہے، زندگی کا بیمہ تو پورے جسم کا بیمہ ہوتا ہے، لیکن اب انفرادی طور پر مختلف اعضاء کے بیمہ کا رواج بھی بکثرت ہوگیا ہے، مثلاً ہاتھوں کا بیمہ، سر کا بیمہ، ٹانگوں کا بیمہ وغیرہ، اس کی شکل بھی وہی ہوتی ہے، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ان شکلوں میں ڈاکٹر کسی ایک عضو کی زندگی یا کارکردگی کا اندازہ لگاتا ہے، اس کے اندازہ پر بقیہ معاملہ اسی طرح ہوتا ہے، جس طرح زندگی کے بیمہ کی صورت میں، اور واپسی رقم مع منافع کی شکلیں وہی تین ہیں، البتہ یہاں پورے جسم کی مدت کے قائم مقام صرف ایک حصہ جسم کی مدت یا اس کے ناکارہ ہونے کو قرار دیا ہے۔

ب: املاک کا بیمہ، عمارت، کارخانہ، موٹر، جہاز وغیرہ ہر چیز کے بیمے کا رواج اب ہوگیا ہے، اس کی شکل بھی وہی ہوتی ہے، یعنی بیمہ دار ایک معینہ مدت کے لئے ایک رقم بالاقساط ادا کرتا ہے، اور کمپنی ایک معینہ مدت کے بعد اسے وہ رقم مع کچھ زائد رقم کے واپس کرتی ہے، اور اگر کسی حادثہ کی وجہ سے بیمہ شدہ املاک تلف ہوجائے، مثلاً کارخانہ میں یکا یک آگ لگ جائے، یا جہاز غرق ہوجائے، یا موٹر کسی حادثہ میں ٹوٹ جائے تو کمپنی اس نقصان کی تلافی کرتی ہے، اور اصل رقم کے ساتھ کچھ مزید رقم، زیادہ شرح فیصد کے حساب سے بیمہ کرانے والے کو دیتی ہے۔

ج:۔ ذمہ داریوں کا بیمہ: اس میں بچہ کی تعلیم، شادی وغیرہ کا بیمہ ہوتا ہے، کمپنی ان کاموں کی ذمہ دار ہوتی ہے، رقم وغیرہ کی ادائیگی اور وصولی کی صورتیں وہی ہوتی ہیں۔

۴:۔ بیمہ کرانے والے کو ایک معینہ رقم بہ ہر صورت بالاقساط ادا کرنی پڑتی ہے، لیکن اگر چند ماہ (حسن قواعد وشرائط) اقساط ادا کرنے کے بعد بیمہ دار رقم کی ادائیگی بند

کردے، تو اس کی ادا کی ہوئی رقم سوخت ہوجاتی ہے، اور واپس نہیں ملتی، لیکن اسے اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے درمیان کے بقایا اقساط ادا کرکے حسب سابق اقساط جاری کرالے، بقایا اقساط نہ ادا کرنے کی صورت میں بھی بعض قواعد کے ماتحت اقساط کا سلسلہ دوبارہ جاری ہوسکتا ہے، لیکن اگر وہ سلسلہ منقطع کرکے جمع شدہ رقم واپس لینا چاہے تو ایسا نہیں کرسکتا۔

۵:۔ بیمہ دار اگر سود نہ لینا چاہے تو کمپنی اسے اس پر مجبور نہیں کرتی اور حسب شرائط اس کو اصل رقم واپس کرتی ہے۔

۶:۔ بیمہ دار دو سال تک قسط ادا کرنے کے بعد کم شرح سود پر قرض لینے کا مجاز ہو جاتا ہے۔

۷:۔ ہندوستان میں زندگی کے بیمہ کے متعلق حکومت نے ایک قانون بنایا ہے، جس کی رو سے بیمہ کی یہ قسم نجی کمپنیوں کے ہاتھ سے نکل کر خود حکومت کے ہاتھ میں آگئی ہے، اور کسی نجی کمپنی کے بجائے یہ معاملہ بیمہ دار اور حکومت کے درمیان ہوتا ہے، بظاہر حالات سے ایسا نظر آتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ پورا کاروبار نیشنلائز کرلیا جائے گا، اور نجی کمپنیاں ختم کرکے حکومت خود یہ معاملہ کرے گی۔

خلاصہ:

بیمہ کی مختلف شکلیں ہیں، لیکن ان سب کی حیثیت وہی ہے جو سب سے پہلے عرض کی جاچکی ہے، یہاں اختصار کے ساتھ مکرر پیش کیا جاتا ہے۔

حقیقت کے لحاظ سے انشورنس کا معاملہ ایک سودی کاروبار ہے، جو بینک کے کاروبار کے مثل ہے، دونوں میں جو فرق ہے وہ شکل کا ہے، حقیقت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں، حقیقت میں اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس میں ربوا کے ساتھ ''غرر'' بھی پایا جاتا ہے۔

بیمہ کرانے والا کمپنی کو روپیہ قرض دیتا ہے اور کمپنی اس رقم سے سودی کاروبار یا

تجارت وغیرہ کر کے نفع حاصل کرتی ہے، اور اس نفع میں سے بیمہ کرانے والے کو بھی کچھ رقم بطور سود ادا کرتی ہے، جس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس منفعت کے لالچ میں زیادہ سے زیادہ بیمہ کرائیں، بینک بھی یہی کرتے ہیں، البتہ اس میں شرح سود مختلف حالات وشرائط کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے، بینک میں عموماً ایسا نہیں ہوتا۔

بیمہ کے مصالح اور مفاسد

دنیاوی نقطۂ نظر سے بیمہ پالیسی خریدنے میں کیا مصلحتیں ہیں اور کیا مفاسد ہیں؟ ان کا تذکرہ درج ذیل ہے، تاکہ حضرات اہل علم ان پر نظر فرما کر فیصلہ فرما سکیں، اس لئے یہاں صرف انہیں دنیاوی مصالح ومفاسد کا تذکرہ ہے جو فی نفسہٖ کسی نہ کسی درجہ میں شرعاً بھی معتد بہ ہیں، جو مصالح ومفاسد شرعاً غیر معتد بہ ہیں، ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، مثلاً اس دنیاوی مصلحت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، کہ اس طرح خریدار کو سود ملتا ہے اور اس کی اصل رقم میں بغیر محنت اضافہ ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ مصلحت شرعاً غیر معتد بہ ہے، بلکہ مصلحت کے بجائے مفسدہ ہے، اسی طرح اس مفسدہ کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے کہ قلیل آمدنی والے افراد جب پالیسی خریدنے کے لئے کچھ رقم پس انداز کریں گے، تو تحسینات میں کمی کرنے پر مجبور ہوں گے اور بعض جائز لذتوں سے محروم رہیں گے، اس لئے کہ یہ مفسدہ شرعاً غیر معتد بہ ہے۔

بیمہ کے مصالح: ناگہانی حوادثات کی صورت میں بیمہ دار تباہی وبربادی سے بچ جاتا ہے مثلاً:

۱۔ ہندو مسلم فساد میں بہت سے مسلمانوں کے کارخانے خاک سیاہ اور تباہ وبرباد کر دیئے گئے جن لوگوں نے اپنے کارخانوں کا بیمہ کرالیا تھا وہ تباہی سے بچ گئے، اور انہوں نے دوبارہ اپنا کاروبار جاری کر دیا، لیکن جنہوں نے بیمہ نہیں کرایا تھا، وہ پورے طور پر برباد ہو گئے پنپ نہ سکے، دوکانوں اور مکانوں وغیرہ کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔

(**نوٹ**: فسادات ہندوستان کا روز مرہ بن چکے اور ان کا انسداد مسلمانوں کی استطاعت سے باہر ہے)

۲۔ اوسط طبقہ کے افراد جو کثیر العیال بھی ہوں، اگر ناگہانی طریقہ سے وفات پا جائیں، تو ان کے پس ماندگان سخت پریشانی میں پڑتے ہیں، اپنی قلیل آمدنی میں عموماً وہ کوئی رقم پس انداز کر کے نہیں رکھ سکتے، جو ان کے پسماندگان کے کام آسکے، ایسی حالت میں اگر وہ بیمہ پالیسی خرید لیں تو ایک طرف تو انہیں پس اندازی میں سہولت ہوتی ہے، دوسرے ان کی ناگہانی وفات پر ان کی پس انداز رقم مع مزید رقم کے ان کے پس ماندگان کو مل جاتی ہے، جو ان کے لئے بہت مفید اور معاون ہوتی ہے۔

تعلیم وغیرہ کی صورت میں تو یہ مصلحت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، اس لئے اگر وہ اپنی اولاد کو مناسب تعلیم دلانے سے قبل وفات پا جائیں تو اولاد کا سلسلہ تعلیم منقطع نہیں ہوتا، اور کسی نہ کسی دن اولاد اس قابل ہو جاتی ہے کہ کچھ کما سکے۔

۳: اگر اولاد نابالغ ہو تو باپ کے مرنے کے بعد ماں کی طرف سے غفلت برتی ہے، اور اس کا شرعی حق نظر انداز کر کے باپ کی کل جائداد واملاک پر قابض ہو جاتی ہے، اس صورت میں اگر شوہر بیمہ کی پالیسی خرید کر اپنی بیوی کو اس کا وراث قرار دیدے تو یہ رقم بیوی کو بے خدشہ مل جاتی ہے۔

اگر اولاد کے درمیان تحاسد وتباغض ہو، یا بعض بچے چھوٹے ہوں، اولاد سے خطرہ ہو کہ ان کے حقوق کو غصب کر لیں گے تو بھی ان کے نام سے بیمہ پالیسی خرید لینا مفید ہو سکتا ہے۔

۴:۔ چونکہ کمپنیاں عموماً اہل ہنود کی ہیں، اس لئے بیمہ پالیسی خریدنا فساد کی تباہ کاریوں کو روکنے کا بھی ایک ذریعہ ہو سکتا ہے، اس لئے کہ فسادی یہ معلوم کر کے کہ مسلمان کی بیمہ شدہ مملوکہ شئی کو نقصان پہنچانا خود ہندوؤں کو نقصان پہنچانا ہے، شاید اس نقصان پہنچانے سے باز رہیں، اس طرح ممکن ہے کہ کسی درجہ میں یہ حفاظت جان کا ذریعہ بھی بن سکے۔

نوٹ: اب سے دوچار صدی بیشتر مسلمانوں کے حالات مختلف تھے، اول تو ناگہانی حادثات کی اتنی کثرت نہیں تھی جو آج مشین کے رواج کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے، دوسرے بکثرت مسلمان اسلامی حکومتوں میں رہتے تھے، جہاں بیت المال بڑی حد تک ان حوادث کے نتائج سے پناہ دیتا تھا، تیسرے مصارف زندگی کا اتنا بوجھ بھی نہیں ہوتا تھا، چوتھے آپس کی ہمدردی کا جذبہ اتنا سرد نہیں ہوا تھا، جتنا آج ہوگیا ہے، پانچویں تعداد کی قلت اور قوم کی بحیثیت مجموعی دولت مندی زکوٰۃ وصدقات کا رواج یہ سب امور مل کر اس قسم کے نقصانات کی تلافی کردیا کرتے تھے، اب ان سب چیزوں کا تقریباً فقدان ہے، آبادی میں اضافہ مزید پریشانی کا باعث ہے، سو(۱۰۰) میں ایک کی تباہ حالی دور کرنا آسان ہے، مگر سو میں (۲۵) کے ساتھ مواسات کرنا بہت مشکل ہے۔

بیمہ کے مفاسد

واضح رہے کہ یہاں صرف دنیاوی مفاسد کا تذکرہ مقصود ہے جن کی طرف بعض اوقات بعض اہل علم کی نظر نہیں جاتی، دینی مفاسد سے چونکہ ہر صاحب علم واقف ہے، اس لئے ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

۱۔ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں کہ کسی وارث نے بیمہ کی رقم وصول کرنے کے لئے مورث کو (جو کہ بیمہ دار تھا) قتل کردیا۔

۲۔اس قسم کے واقعات بھی پیش آتے ہیں کہ بیمہ دار نے دھوکہ دے کر اپنی دوکان یا اپنے مکان یا کسی اور چیز کی مالیت زیادہ ظاہر کردی، اور اس کا بیمہ کرادیا اور کچھ عرصہ کے بعد سود کی رقم (جو اس کی مملوکہ شئی کہ مالیت سے متعدبہ حد تک زائد تھی) وصول کرنے کے لئے اس شئی کو مخفی طریقہ سے خود تلف کردیا، مثلاً آگ لگادی، یا اور اسی قسم کی حرکت کی اور اس طرح نقصان کی تلافی کے ساتھ مزید نفع بھی اٹھایا۔

اس قسم کے واقعات کی تعداد اگرچہ قلیل ہے، مگر نہ تو بعید از قیاس ہے نہ اتنے کم انہیں النادر کالمعدوم کہا جاسکتے ہیں۔

۳۔تجربات شاہد ہیں کہ جو دولت بے مشقت اور بے محنت ہاتھ آجاتی ہے، آدمی اسے بہت بیدردی کے ساتھ خرچ کرتا ہے، نوجوان اولاد کو اگر باپ کے بعد بیمہ کی رقم بغیر محنت کوشش ملے گی تو ظن غالب یہی ہے کہ وہ اسے بے دریغ صرف کرکے گی، اسراف و تبذیر کی عادت فی نفسہ مذموم ہونے کے علاوہ افلاس وتباہی کا پیش خیمہ ہے، جو اخلاقی خرابیاں ایسی صورت میں پیدا ہوتی ہیں ان کی تفصیل بے ضرورت ہے۔

۴۔یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ بیمہ پالیسی کی خریداری میں سرمایہ دار طبقہ ہی پیش پیش ہوسکتا ہے سود کی رقم اس کی دولت میں اور اضافہ کرے گی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ داری کو مزید ترقی ہوگی۔

ان تمہیدی امور کے عرض کرنے کے بعد حضرات علماء کرام سے درخواست ہے کہ ''انشورنس'' کے متعلق مندرجہ بالا حقیقت اور اس کے مصالح ومفاسد کو پیش نظر رکھ کر شریعت مقدسہ اسلامیہ کی روشنی میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں، ضروری استدعا یہ ہے وہ براہ کرام جوابات مدلل اور واضح عنایت فرمائیں۔

بیمہ کے متعلق چند ضروری سوالات

۱۔انشورنس کی جو حقیقت اوپر عرض کی گئی ہے، اس میں کمپنی جو رقم بطور سود دیتی ہے، جس کا نام وہ اپنی اصطلاح میں منافع رکھتی ہے، شریعت کا اصطلاحی ربوا ہے یا نہیں؟

۲۔اگر سود مذکور شرعی اصطلاح میں ربوا ہے تو کیا مصالح مذکورہ کے پیش نظر اس کے جواز کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟ اگر نکل سکتی ہے تو کیسے؟

۳۔زندگی کے بیمہ، املاک کے بیمہ، ذمہ داری کے بیمہ کے درمیان شرعاً کوئی فرق ہوگا، یا تینوں کا حکم ایک ہوگا؟

۴۔معاملہ کی یہ شرط کی اگر بیمہ شدہ شخص یا شئی وقت معین سے پہلے تلف ہوجائے تو اتنی رقم ملے گی اور اس کے بعد تلف ہوئی، تو اتنی جب کہ تلف ہونے کے وقت کا تعین غیر ممکن ہے، اس معاملہ کو قمار کے حدود میں تو نہیں داخل کردیتی ہے؟

۵۔اگر یہ قمار یا غرر ہے تو کیا مصالح مذکورہ کے پیش نظر اسے نظر انداز کر کے اس معاملہ کے جواز کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے اور اگر نکل سکتی ہے تو کیسے؟

۶۔اگر بیمہ دار مندرجہ ذیل اقسام بیمہ میں سے کسی میں سود لینے سے بالکل محترز رہے، اور اپنی اصل رقم کی صرف واپسی چاہتا ہو تو کیا یہ معاملہ جائز ہو سکتا ہے؟

۷۔جو رقم کمپنی بطور سود ادا کرتی ہے، اسے ربوا کے بجائے اس کی جانب سے اعانت وامداد اور تبرع واحسان قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

۸۔اگر کوئی مسلمان کسی دارالحرب کا باشندہ ہو (مستأمن نہیں) اور کمپنی حربیوں ہی کی ہو، تو کیا اس صورت میں یہ معاملہ مسلمانوں کے لئے جائز ہوگا؟

۹۔اس صورت میں جب کہ انشورنس کاروبار خود حکومت کر رہی ہو، اور اس صورت میں جب کہ یہ کاروبار نجی کمپنیاں کر رہی ہو، کوئی فرق ہے یا نہیں؟

۱۰۔اگر یہ کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہو تو کیا اس بنیاد پر کہ خزانۂ حکومت میں رعیت کے ہر فرد کا حق ہوتا ہے، زیر بحث معاملہ میں سود کی رقم عطیہ حکومت قرار پا کر ''ربوا'' کے حدود سے خارج ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اور کیا اس صورت میں یہ معاملہ جائز ہو سکتا ہے؟

۱۱۔فرض کیجئے بیمہ کا کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہے، ایک شخص بیمہ پالیسی خریدتا ہے اور میعاد معین کے بعد اصل مع سود کے وصول کرتا ہے لیکن۔

(الف) سود کی کل رقم بصورت ٹیکس وچندہ حکومت کو دیتا ہے۔

(ب) ایسے کاموں میں لگا دیتا ہے جن کا انجام دینا، خود حکومت کے ذمہ ہوتا ہے، مگر وہ لاپرواہی یا کسی دشواری کی وجہ سے انہیں انجام نہیں دیتی، مثلاً کسی جگہ پل یا راستہ بنوانا، کسی تعلیمی ادارے کو امداد دینا، کنواں کھودوانا، یا نل لگوانا وغیرہ جہاں یہ امور قانوناً حکومت کے ذمہ ہوں۔

ج: ایسے کاموں میں صرف کرتا ہے، جو قانوناً حکومت کے ذمہ نہیں ہوتے، مگر عام طور پر رعایا ان کے بارے میں حکومت کی امداد چاہتی ہے، اور حکومت بھی ان کی اس خواہش

کو مذموم نہیں سمجھتی، بلکہ بعض اوقات امداد کرتی ہے، مثلاً کسی جگہ کتب خانہ کھول دینا وغیرہ۔

تو کیا مندرجہ بالا صورتوں میں اس شخص کے لئے بیمہ پالیسی کی خریداری جائز ہوگی، اور ربوا لینے کا گناہ تو نہ ہوگا؟

نوٹ: مندرجہ بالا تینوں صورتوں (الف، ب، ج) کے احکام میں اگر فرق ہے تو اسے واضح فرمایا جائے۔

۱۲۔بیمہ دار اگر سود کی رقم بغیر نیت ثواب کے کسی دوسرے شخص کو امداد کے طور پر دے دیتا ہے، تو کیا اس صورت میں انشورنس کا معاملہ جائز ہوگا؟

اگر انشورنس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے، تو کیا مصالح وحاجات مذکورہ کو سامنے رکھ کر۔

الف: اس کا کوئی بدل ہو سکتا ہے جس میں مصالح مذکور موجود ہوں، اور اس پر عمل کرنے سے ارتکاب معصیت لازم نہ آئے، اگر ہو سکتا ہے تو کیا؟ یا

ب: انشورنس کی مروجہ شکل میں کیا کوئی ایسی ترمیم کی جا سکتی ہے، جو اسے معصیت کے دائرے سے خارج کر دے اور مصالح مذکورہ کو فوت نہ کرے، اگر ہو سکتی ہے تو کیا؟

احقر محمد اسحاق سندیلوی عفی عنہ کنوینر

۱۹/اکتوبر ۱۹۶۴ء

●●●

جواب: مفتی شفیع صاحب

بجواب سوالنامہ مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، کنوینر مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

امابعد! اوراللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائیں، وقت کے اہم مسئلہ کی طرف آپ نے توجہ فرمائی، اور جواب دینے والے کے لئے معاملہ کی نوعیت کو سمجھنے کی مشکل حل کر دی، آج کل جدید قسم کے معاملات جو عام طور پر بازاروں اور معاشرہ میں رواج پا گئے ہیں ان کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کرنے میں اہل علم کے لئے ایک بڑی دشواری یہ بھی پیش آتی ہے کہ ان معاملات کے کرنے والے شرعی اصطلاحات سے واقف نہیں ہوتے کہ معاملہ کی صحیح نوعیت بیان کرسکیں اور جواب دینے والے اہل فتویٰ عموماً ان معاملات کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے اوراس کی واقفیت حاصل کرنا بھی ان کے لئے آسان نہیں ہوتا۔

عرصہ دراز ہوا کہ احقر سے ایک بیمہ کمپنی کے کسی ایجنٹ نے اس کے جواز وعدم جواز کا سوال کیا ان کے پیش نظر تو صرف اتنا تھا کہ میری طرف سے کوئی صرف جواز کا فتوی ہاتھ آجائے تو وہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کو بیمہ کرانے کی ترغیب کا اشتہار اوراپنے کاروبار کی ترقی کا ذریعہ بنائیں، جیسا کہ ان کی دی ہوئی ایک کتاب میں دوسرے بہت سے علماء کے ایسے کلمات کو بطور اشتہار انہوں نے استعمال کیا ہوا تھا اور ایک بڑے ماہر مفتی کی طرف منسوب کر کے جو عبارت لکھی ہوئی تھی اس میں درمیان سے ایک پوری سطر کاٹ کر نقطے

لگائے ہوئے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سطر میں مفتی صاحب موصوف نے کمپنی کی منشاء کے خلاف کوئی بات لکھی تھی اس لئے اس کو درمیان سے حذف کر دیا مگر دیانت کا اتنا پہلو بھی غنیمت نظر آیا کہ درمیان میں سے ایک سطر کی خالی جگہ نقطے لگا کر اتنا بتلا دیا تھا کہ مفتی صاحب کی یہ عبارت مسلسل نہیں احقر نے اس طرز عمل کو دیکھنے کے بعد احتیاط ضروری سمجھی اوران سے عرض کیا کہ بیمہ کے قواعد وضوابط مکمل آپ مجھے دیں ان کو دیکھ کر میں کوئی جواب دوں گا، اس پر جو کاغذات انھوں نے میرے لئے مہیا کئے وہ صرف بیمہ زندگی سے متعلق تھے ان کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ بیمہ زندگی میں شرعی حیثیت سے تین مفاسد ہیں اول سود دوسرے قمار تیسرے معاہدہ کی بعض شرائط فاسدہ، اس لئے بحالت موجودہ اس کے جواز کی صورت نہ تھی احقر نے ان کو ایک مسودہ ترمیم کا لکھ کر دیا جس کے ذریعہ یہ کاروبار بغیر کسی قسم کے نقصان کے حرام وگناہ سے نکل جائے۔ انہوں نے ترمیم منظور کرا کر جاری کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا، مگر پھر اس کا کوئی اثر بیمہ کمپنی کے معاملات میں نظر نہ آیا شاید وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے۔

احقر نے بارہا ارادہ کیا کہ کم از کم مسئلہ کی حیثیت اور ترمیم کی صورت کو شائع کر دیا جائے، مگر اول تو اس پر مکمل اطمینان نہیں تھا کہ معاملہ کی نوعیت جو ان کاغذات کے مطالعہ سے میں نے سمجھی اور صحیح قرار دی ہے، اس میں کوئی غلطی نہیں، دوسرے بیمہ کی دوسری اقسام کو جمع کرنے اوراس کے مکمل احکام بیان کرنے کا داعیہ بھی تھا، جس کے نتیجہ میں آج تک یہ ارادہ ارادہ ہی رہا عملی صورت اختیار نہ کرسکا پھر مشاغل وذواہل نے فرصت نہ دی اور روز بروز قوی کے انحطاط اور ضعف نے ارادہ کو بھی اسی نسبت سے ضعیف کر دیا، جناب کے مرسلہ سوالنامہ نے معاملہ کی نوعیت کو پوری طرح واشگاف اور بیان کر دیا، اوراس کی تمام اقسام کو بھی واضح انداز میں ذکر کر کے کچھ لکھنے کی ہمت پیدا کر دی، اگر رائج الوقت معاملات جدیدہ کے متعلق اسی طرح معاملہ کی پوری تحقیق اہل معاملہ سے معلوم کر کے سوال نامے سے مرتب کر لئے جائیں تو سمجھتا ہوں کہ مجلس تحقیقات کا یہ بھی بڑا کارنامہ ہوگا۔ واللہ

الموفق ۔خصوصاً اس لئے کہ اب یہ میرا جواب کوئی آخری فیصلہ نہیں ، دوسرے علماء کے سامنے پیش ہوکر اس کی اصلاح بھی ہوسکے گی۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اسأل السداد والصواب والیہ المرجع والمأب.

الجواب:

(۱) ظاہر ہے کہ محض نام بدل دینے سے کسی معاملہ کی حقیقت نہیں بدلتی بیمہ کمپنی کے منافع بلاشبہ سود ور بوا کی تعریف میں داخل ہیں بینک کے سود کور بوا کی تعریف سے خارج کرنے کے لئے جو وجوہ بعض نوتعلیم یافتہ حضرات نے لکھے ہیں، ان کا مفصل جواب احقر کے رسالہ ''مسئلہ سود'' میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اس میں سود و ربوا کی تعریف بھی وضاحت کے ساتھ لکھ دی گئی ہے۔

(۲) سود کے جواز کی تو کوئی گنجائش نہیں کہ اس کی حرمت قطعی اور شدید ہے جس کی تفصیل احقر کے رسالہ ''مسئلہ سود'' میں دیکھی جاسکتی ہے، البتہ بیمہ کے قواعد وضوابط میں ترمیم کرکے اس کو ایک نفع بخش شرعی معاملہ بنایا جاسکتا ہے، جس کا ذکر تفصیل میں آئے گا۔

(۳) تشریح اس کی یہ ہے کہ (الف) قرآن کریم کی آیت ''وَاَحَلّ اللہ البیع وحرم الربوا ''میں بیع وتجارت کو حلال اور اس کے مقابل ربوا کو حرام قرار دیا ہے، بیع یا تجارت ایک مشترک کاروبار میں نفع نقصان کی منصفانہ تقسیم کا نام ہے اور ربوا اس زیادتی کا نام ہے جو تجارتی نفع نقصان سے قطع نظر کرکے اپنی رقم کی میعاد معین کے معاوضہ میں وصول کی جائے ،خواہ کاروبار میں کتنا ہی نفع یا نقصان ہو، ظاہر ہے کہ بیمہ کی تینوں صورتوں میں جو منافع یا بونس دیا جاتا ہے وہ بیع وتجارت کے اصول پر نہیں بلکہ ربوا کے طور پر دیا جاتا ہے۔

(ب) اور چونکہ حوادث کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ واقع ہوں گے یا نہیں ، اور ہوں گے تو کب اور کس پیمانہ پر اس مبہم اور نامعلوم چیز پر کسی نفع کو معلق کرنا ہی قمار ہے، جس کو قرآن کریم نے بلفظ میسر حرام قرار دیا ہے، بیمہ کا مدار ہی اس نامعلوم اور مبہم نفع کی

امید پر ہے جو بلاشبہ قمار میں داخل ہے۔

(ج) تینوں قسم کے بیموں میں جو یہ شرط ہے کہ جو شخص کچھ رقم بیمہ پالیسی کی جمع کرنے کے بعد باقی قسطوں کی ادائیگی بند کردے اس کی جمع کردہ رقم سوخت ہوجاتی ہے یہ شرط خلاف شرع اور ناجائز ہے (۱)، قواعد شرعیہ کی رو سے اس کو تکمیل معاہدہ پر مجبور تو کیا جا سکتا ہے اور عدم تعمیل کی صورت میں کوئی تعزیری سزا بھی دی جاسکتی ہے، ادا کردہ رقم کو اس جرمانہ میں ضبط کرلینا جائز نہیں ہوسکتا، یہ تین خلاف شرع امور اور گناہ کبیرہ ہیں جو تینوں قسم کے بیموں میں موجود ہیں اس لئے بلحاظ حکم شرعی تینوں میں کوئی فرق نہیں سب کے سب ناجائز ہیں، بیموں کی ان تینوں قسموں کا عام رواج غالباً اسی صدی کے اندر ہوا ہے اسلئے فقہاء متاخرین کے مباحث اور فتاویٰ میں بھی کہیں ان کا ذکر نہیں ملتا۔

۴۔ البتہ ایک چوتھی قسم بیمہ کی اور ہے جس کو سوال میں نہیں لیا گیا وہ سندات و کاغذات اور نوٹوں کا بیمہ ہے اس کا رواج غالباً کچھ قدیم ہے اسی لئے علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ جو متاخرین میں افضل الفقہاء مانے گئے ہیں انہوں نے اس کا ذکر کتاب الجہاد باب المستأمن میں بنام سوکرہ کیا ہے مگر اس کی جو صورت لکھی ہے وہ موجودہ بیمہ سندات وکاغذات سے کسی قدر مختلف ہے، علامہ شامی نے ان کو بھی ناجائز قرار دیا ہے مگر انھیں کی تحریر سے بیمہ سندات وکاغذات کی مروجہ صورت کا جواز معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں نقل کیا ہے **ان المودع اذا اخذ الاجرۃ علی الودیعۃ یضمنھا اذا ھلکت** (۲) یعنی جس شخص کو کوئی سامان بغرض حفاظت دیا جائے ،اگر وہ اس کی حفاظت کا معاوضہ لیتا ہے تو ضائع ہوجانے کی صورت میں اس پر ضمان واجب ہوگا۔

ظاہر ہے کہ محکمہ ڈاک وغیرہ جو سندات کاغذات وغیرہ سربمہر کرکے حفاظت کے وعدہ پر لیتا ہے اور اس کی حفاظت کی فیس بھی لیتا ہے تو ضائع ہوجانے کی صورت میں مذکورہ روایت کی بناء پر ضائع شدہ کاغذات کا ضمان اس پر لازم آئے گا۔

---

(۱) شرط فاسد بیع کو فاسد کردیتی ہے۔ (۲) شامی طبع استنبول ۳/۳۴۵۔

(۵) یقیناً قمار میں داخل ہے کیونکہ کسی معاملہ میں نفع نقصان کے کسی غیر معین غیر معلوم چیز پر معلق رکھنے ہی کا نام قمار ہے۔

(۶) غرر تو نہیں مگر خطر ضرور ہے جو بنیاد ہے قمار کی اور ربوا کی طرح اس کی بھی حرمت قرآن کی نص قطعی میں آئی ہے اور اس کو بت پرستی کے مساوی جرم اور شیطانی عمل قرار دیا ہے۔ ﴿**انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ**﴾ (۱) اس لئے اس کے جواز کی تو کوئی گنجائش مصالح مذکورہ کی بناء پر نہیں ہوسکتی، البتہ قواعد میں ترمیم کرکے جائز معاملہ بنایا جاسکتا ہے جس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

(۷) جائز ہے صرف اتنی قباحت ہے کہ اس کے روپیہ سے سود و قمار کا معاملہ کرنے والوں کی کسی نہ کسی درجہ میں امداد ہوتی ہے اگرچہ سبب بعید ہونے کے سبب اس کو حرام نہ کہا جائے گا، کیونکہ یہاں سود و قمار کا معاملہ کرنے والے دوسرے لوگ ہیں جن کا یہ حصہ دار نہیں اور نہ اس کا روپیہ ان کے فعل حرام کے لئے محرک اور داعی بنا ہے ہاں غیر ارادی طور پر اس کے روپیہ سے ان کی امداد ہوگئی اس طرح کے تسبب للمعصیۃ (معصیت کا سبب بننا) کو حرام نہیں کہا جاسکتا البتہ خلاف اولیٰ ضرور ہے، جس کی تعبیر فقہاء کی اصطلاح میں مکروہ تنزیہی سے کی جاتی ہے جیسے فاسق بدکار یا فاحشہ کے ہاتھ کے کھانے پینے کی چیزیں یا لباس اور زینت کی اشیاء فروخت کرنا جن سے وہ اپنے فسق و فجور میں کام لیتے ہیں حرام صرف وہ تسبب ہے جو معصیت کے لئے محرک اور داعی ہو جیسے قرآن کریم میں عورتوں کو پاؤں زمین میں اس طرح مارنے کی ممانعت ہے جس سے ان کا زیور بجے اور غیر محرم مردوں کی نظریں اس طرف متوجہ ہوکر نظر بد کے لئے محرک بنے۔ ﴿**ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن**﴾ (۲) یا کفار کے معبودوں کو برا کہنے کی ممانعت اس لئے آئی کہ وہ کفار کے لئے اللہ جل شانہ کی شان میں گستاخی کی محرک اور داعی بنے گی (۳)، اسی فرق کو حضرات فقہاء نے کہیں سبب قریب و بعید کے عنوان سے اور کہیں ما قامت المعصیۃ بعینہ وبغیرہ کے عنوان سے

(۱) مائدہ:۹۰۔ (۲) نور:۳۱۔ (۳) سورہ انعام:۱۰۸۔

تعبیر کیا ہے اسی لئے بیمہ کمپنی میں روپیہ صرف اس نیت سے جمع کرنا کہ رقم پس انداز ہوجائے اور وقت ضرورت کام آئے اور اس کا سود نہ لینے کی صورت میں خلاف اولیٰ مگر جائز ہے۔

(۸) تبرع و احسان کی کوئی علامت یہاں موجود نہیں تبرع و احسان پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، یہاں عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ جبراً وصول کیا جاسکتا ہے اور یہ بھی بدیہی ہے کہ کمپنی کو براہ راست کسی غریب مصیبت زدہ سے کوئی ہمدردی نہیں کہ وہ اس مد میں کچھ خرچ کرے، وہ خالی ایک تجارت یا کاروبار ہے جو اس نظریہ پر قائم ہے کہ عادۃً حوادث کا اوسط کیا رہے گا اور کمائی کا اوسط کیا، حوادث کے اوسط کو حاصل شدہ رقم کے اوسط سے بہت کم محسوس کرکے باقی ماندہ منافع کے لئے یہ کاروبار جاری ہے، بعض علماء عصر نے جو اس کو امداد باہمی کا معاہدہ قرار دے کر مولی الموالاۃ کے احکام پر قیاس فرمایا اور عقد موالاۃ کی طرح اس کو بھی جائز قرار دیا وہ بالکل قیاس مع الفارق ہے کیونکہ عقد موالاۃ کا جواز جو بروایت ابوداؤد حضرت تمیم داریؓ کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے وہ صرف نومسلموں کے لئے ہے جن کا کوئی وارث مسلمان موجود نہ ہو اگر وہ کسی شخص سے بھائی چارہ کا معاہدہ کرلے تو وہ ایک حیثیت سے ان کا بھائی قرار پائے، زندگی میں جو جنایات کی دیت کسی بھائی پر عائد ہوتی ہیں وہ اس شخص پر عائد ہوگی اور مرنے کے بعد اس کی وراثت کا یہ حقدار قرار پائے گا، یہ عقد موالاۃ حدیث مذکور کی بناء پر صرف وہ شخص کرسکتا ہے جس کا کوئی مسلمان وارث نہ ہو اور اگر اس کا کوئی مسلمان وارث نزدیک یا دور کا خواہ عصبات میں سے ہو یا ذوی الارحام میں سے موجود ہو تو اس کا یہ عقد موالاۃ کسی شخص سے باطل کالعدم ہے کیونکہ وارث کا حق تلف کرنے کا اس کو اختیار نہیں اسی لئے صاحب ہدایہ نے لکھا ہے ''**وان کان لھم وارث فھو اولیٰ منہ وان کانت عمۃ او خالۃ او غیرھما من ذوی الارحام**'' (کتاب الولاء) اسی سے واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ عقد موالات جو صرف نومسلموں کے لئے لاوارث ہونے کی حالت میں جائز کیا گیا ہے اس پر عام امداد باہمی کے معاہدہ کو قیاس کرنا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔

اور یہ اس وقت ہے جب کہ بیمہ کے کاروبار کو امداد باہمی کا معاہدہ سمجھ لیا جائے جس کے سمجھنے کی کوئی گنجائش نہ بیمہ کمپنی کے کاروبار میں نظر آتی ہے نہ بیمہ پالیسی کے خریدنے والوں کے معاملات سے اس کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے۔

مروجہ بیمہ کو امداد باہمی کہنا ایک دھوکہ ہے حقیقت یہ ہے کہ بیمہ اور سٹہ سودی کاروبار پر آنے والی نحوست کو پوری قوم کے سر پر ڈالنے کا ایک خوبصورت حیلہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ سودی کاروبار کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ دس ہزار کا سرمایہ رکھنے والا اپنے دس ہزار کے ساتھ بینکوں کے ذریعہ پوری قوم کی نوے ہزار مزید بطور سودی قرض وصول کر کے مثلاً ایک لاکھ کا کاروبار کرتا ہے، آگے اس تجارت میں جو نفع ہوتا ہے وہ سارا کا سارا کاروبار کرنے والے کا مال ہے برائے نام دو فیصد یا چار فیصد کے حساب سے قومی سرمایہ کا سود ہوتا ہے جو حصہ داروں میں تقسیم ہو کر ایک بے منفعت اور بے فائدہ اضافہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا البتہ کاروبار کرنے والے کی رقم ایک لاکھ کے دو لاکھ ہو جاتی ہے اور اس کی سرمایہ داری بڑھتی جاتی ہے اور اگر فرض کیجئے کہ اس کی تجارت پر زوال آیا تو اس کا سرمایہ بھی ڈوب گیا تو اس کا نقصان صرف دس ہزار کا یعنی دس فیصد باقی سرمایہ پوری ملت کا تھا ان کا نقصان نوے فیصد ہوا اول تو یہی ظلم کچھ کم نہیں کہ ملت کو نفع ملے تو چار فیصد کے حساب سے ملے اور نقصان ہو تو نوے فیصد کے حساب سے پہنچے اس کے علاوہ سودی کاروبار کرنے والے خود غرض لوگوں نے اپنے دس ہزار کے نقصان کو بھی پوری قوم کے سر ڈال دینے کے لئے دو طریقے ایجاد کر لئے، ایک بیمہ، دوسرا سٹہ، کیونکہ تجارت میں نقصان دو طریقوں سے ہوتا ہے، کبھی کوئی حادثہ آگ لگ جائے یا جہاز ڈوب جانے وغیرہ سے پیش آجائے کبھی سامان تجارت کی قیمت گھٹ جائے تو نقصان ہوتا ہے پہلے نقصان کو جو خالص اس کی ذات پر پڑنے والا تھا اس کو بیمہ کے ذریعہ پوری ملت کے سرمایہ پر ڈال دیا اور دوسرے نقصان سے بچنے کے لئے سٹھ کا بازار گرم کیا کہ جب ذرا نقصان کا خطرہ نظر آئے تو اپنی بلا دوسرے کے سر ڈال کر خود نقصان سے صاف اور بیباک ہو جائے، اسی طرح اگر غور کیا جائے تو

معلوم ہوگا کہ بیمہ اور سٹھ درحقیقت سودی کاروبار کے تتمات ہیں جن کو بڑی ہوشیاری اور بڑی خوبصورتی سے ہمدردی اور امداد باہمی کا عنوان دیا جاتا ہے۔

(۸) اگر کمپنی حربیوں کی ہے اور مسلمان کوئی اس میں حصہ دار نہیں ہے تو اس میں بیمہ پالیسی لے کر کوئی نفع خواہ ربوا کا یا حادثہ کا حاصل کر لینا مسئلہ مختلف فیہا ہو جائے گا جو امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو جائز ہی ہے مگر دوسرے ائمہ اجازت نہیں دیتے ہیں امام اعظمؒ کے مسلک پر بھی جواز اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ کوئی مسلمان اس میں حصہ دار نہ ہو، مگر عملاً ایسا ہونا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔

(۹ و ۱۰) ایک فرق ہے کہ حادثہ کی صورت میں جو رقم حکومت سے ملے گی اس کو حکومت کا عطیہ قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ایسے حالات میں امداد کرنا عموماً حکومتوں کی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے مگر ربوا کا معاملہ پھر بھی حرام ہی رہے گا اس میں بھی اور حکومت کے کاروبار میں کوئی فرق نہیں۔

(۱۱) (الف) یہ صورت جائز ہے کہ حکومت کی طرف سے جو غیر شرعی ٹیکس عائد ہیں ان کو ادا کرنے کے لئے حکومت ہی سے اس کے قانون کے مطابق کوئی رقم حاصل کر لی جائے خواہ اس کے حصول کا ذریعہ ربوا کے عنوان میں آتا ہو مگر شرط یہ ہے کہ صرف اتنی ہی رقم وصول کی جائے جتنی حکومت کے غیر شرعی ٹیکسوں میں دینی ہے۔

(۱۱) ب۔ از روئے قواعد تو اس کی بھی گنجائش ہے مگر انفرادی طور پر عملاً ایسا ہونا مشکل ہے، اس کا نتیجہ پھر یہی ہوگا کہ صرف کرنے والے اس سے اپنے مفاد حاصل کر لیں گے جو ناجائز ہے ہاں کسی ایسے ادارہ کو یہ رقم سپرد کر دی جائے جو ذمہ داری کے ساتھ انہیں کاموں میں صرف کر دے جن کے پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت پر ہے مگر حکومت کسی وجہ سے اس کو پورا نہیں کر رہی ہے تو مضائقہ نہیں۔

(۱۱) ج۔ جو کام حکومت کی ذمہ داری اور فرائض میں داخل نہیں کبھی تبرعاً حکومت اسے بھی کر دیتی ہے ان کاموں پر صرف کرنے کے لئے حکومت کی بیمہ پالیسی سے کسی

ناجائز طریقہ پر رقم حاصل کرنا جائز نہیں ہوسکتا کیونکہ جواز کی علت اس تاوان سے بچنا ہے جو حکومت کی طرف سے غیر شرعی طور پر عائد کیا گیا ہو وہ علت (ج) صورت میں مفقود ہے

(۱۲) صدقہ کرنے کی نیت سے سود یا قمار کی رقم حاصل کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ صورت ایک گناہ کر کے اس سے توبہ یا کفارہ کر دینے کی ہے ناجائز طریقہ سے جو رقم کسی کو حاصل ہوگئی ہے اس کے گناہ کا کفارہ یہی ہے کہ اس رقم کو صدقہ کر دے اسی وجہ سے اس میں نیت ثواب رکھنا بھی جائز نہیں بلکہ نیت کفارہ کی ہونی چاہئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس نیت کی وجہ سے بیمہ پالیسی کی ناجائز رقم حاصل کر لینے کا درجہ یہی ہے کہ جیسے کوئی توبہ اور کفارہ کی نیت سے کسی گناہ پر اقدام کرے کہ اس کے اس اقدام کو جائز نہیں کہا جاسکتا۔

بیمہ کے صحیح بدل کی تجویز یا قواعد میں ترمیم

آخری سوالات (الف اور ب) میں ایسی صورت کا سوال کیا گیا جس میں شرعی حیثیت سے کوئی قباحت نہ ہو اور بیمہ کے مصالح اس سے حاصل ہوسکیں، اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اصول شرعیہ کے ماتحت اس کے ایسے بے خطر اور بے ضرر بدل موجود ہیں کہ ان کو بروئے کار لایا جائے تو نہ صرف مروجہ بیمہ کا اچھا بدل بن سکیں بلکہ قوم کے کمزور افراد کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا بہترین ذریعہ بن سکتے ہیں مگر یہ سب کچھ اسی وقت ہوسکتا ہے جب قوم میں اسلامی حمیت اور قومی غیرت کا شعور بیدار ہو، اپنی زندگی اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لئے تھوڑی بہت محنت اور قربانی کے لئے تیار ہوں اور اگر دوسروں کی نقالی ہی کو سرمایہ سعادت و ترقی سمجھ کر اس کے حصول میں حلال و حرام کے امتیاز اور فکر آخرت سے بے نیازی پائی جائے تو ظاہر ہے کہ یوروپ کے شاطر ہمارے اسلامی نظام کے لئے خود کوئی تبدیلی کرنے سے رہے۔

یہاں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ معاملہ انفرادی نہیں اجتماعی ہے اگر چند افراد و آحاد اس مقصد کے لئے تیار بھی ہوں تو یہ کام نہیں چل سکتا جب تک کوئی معتد بہ جماعت اس کام

کو مقصد زندگی بنا کر آگے نہ بڑھے۔

مروجہ بیمہ کا صحیح بدل

(۱) بیمہ پالیسی کی حاصل شدہ رقوم کو مضاربت کے شرعی اصول کے مطابق تجارت پر لگایا جائے، اور معینہ سود کے بجائے عام تجارتی کمپنیوں کی طرف تجارتی نفع تقسیم کیا جائے، نقصان سے بچنے کے لئے لمیٹیڈ کمپنیوں کی طرح اس کی نگرانی پوری کی جائے اور پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کیا جائے، سود خواری کی خود غرضانہ اور غیر منصفانہ عادت کو گناہ عظیم سمجھا جائے کہ دوسرے شریک کا چاہے سارا سرمایہ ضائع ہو جائے ہمیں اپنا راس المال مع نفع کا اسی سے وصول کرنا ضروری ہے یہی وہ منحوس چیز ہے جس کے سبب نص قرآنی کے مطابق سود کا مال اگرچہ گنتی میں بڑھتا نظر آئے، مگر معاشی فوائد کے اعتبار سے وہ گھٹ جاتا ہے اور انجام کار تباہی لاتا ہے(۱) اور یہ گنتی کا فائدہ بھی پوری قوم سے سمیٹ کر چند افراد یا خاندانوں میں محصور ہو جاتا ہے اور ان کے علاوہ پوری قوم مفلس سے مفلس تر ہوتی جاتی ہے۔

(۲) بیمہ کے کاروبار کو امداد باہمی کا کاروبار بنانے کے لئے بیمہ پالیسی خریدنے والے اپنی رضامندی سے اس معاہدہ کے پابند ہوں کہ اس کاروبار کے منافع کا ایک معتد بہ حصہ نصف یا تہائی و چوتھائی ایک ریزرو فنڈ کی صورت میں محفوظ رکھ کر وقف کریں گے جو حوادث میں مبتلا ہونے والے افراد کے امداد پر خاص اصول و قواعد کے ماتحت خرچ کیا جائے گا۔

(۳) بصورت حوادث یہ امداد صرف ان حضرات کے ساتھ مخصوص ہوگی جو اس معاہدہ کے پابند اور اس کمپنی کے حصہ دار ہیں اوقاف میں ایسی تخصیصات میں کوئی مضائقہ نہیں، وقف علی الاولاد اس کی نظیر موجود ہے۔

(۴) اصل رقم مع تجارتی نفع کے ہر فرد کو پوری پوری ملے گی اور وہی اس کی ملک اور حقیقت سمجھی جائے گی، امداد باہمی کا ریزرو فنڈ وقف ہوگا جس کا فائدہ وقوع حادثہ کی

(۱) بقرہ:۲۷۶۔

صورت میں اس وقف کرنے والے کو بھی پہنچے گا اور اپنے وقف سے خود کوئی فائدہ اٹھانا اصول وقف کے منافی نہیں جیسے کوئی شخص افادہ عام کے لئے ہسپتال وقف کرے پھر بوقت ضرورت اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے یا قبرستان وقف کرے پھر خود اس کی اور اس کے اقرباء کی قبریں بھی اس میں بنائی جائیں۔

(۵) حوادث پر امداد کے لئے مناسب قوانین بنائے جائیں، جو صورتیں عام طور پر حوادث کہی اور سمجھی جاتی ہیں ان میں پسماندگان کی امداد کے لئے معتد بہ رقم مقرر کی جائے۔

اور جو صورتیں عادۃً حوادث میں داخل نہیں سمجھی جاتی جیسے کسی بیماری کے ذریعہ موت واقع ہوجانا اس کے لئے یہ کیا جاسکتا ہے کہ متوسط تندرستی والے افراد کے لئے ساٹھ سال کو عمر طبعی قرار دے کر اس سے پہلے موت واقع ہوجانے کی صورت میں بھی کچھ مختصر امداد دی جائے متوسط تندرستی کو جانچنے کے لئے جو طریقہ ڈاکٹری معائنہ کا بیمہ کمپنی میں جاری ہے وہ استعمال کیا جاسکتا ہے، بیمار یا ضعیف آدمی کے لئے اسی پیمانہ سے عمر طبعی کا ایک انداز مقرر کیا جاسکتا ہے۔

(۶) چند قسطیں ادا کرنے کے بعد سلسلہ بند کردینے کی صورت میں دی ہوئی رقم کو ضبط کرلینا ظلم صریح اور حرام ہے اس سے اجتناب کیا جائے، ہاں کمپنی کو ایسے غیر محتاط لوگوں کے ضرر سے بچانے کے لئے معاہدہ کی ایک شرط رکھی جاسکتی ہے کہ کوئی شخص حصہ دار بننے کے بعد اپنا حصہ واپس لینا چاہے یعنی شرکت کو ختم کرنا چاہے تو پانچ یا سات یا دس سال سے پہلے رقم واپس نہ کی جائے گی اور ایسے شخص کے لئے تجارتی نفع کی شرح بھی بہت کم رکھی جاسکتی ہے بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کل معہودہ رقم کے نصف ہونے تک کوئی نفع نہیں دیا جائے گا نصف کے بعد ایک خاص شرح نفع کی متعین کردی جائے مثلاً روپیہ میں ایک آنہ، دو آنہ، یہ سب امور منتظمہ کمیٹی کی صوابدید سے طے ہوسکتے ہیں، ان کا اثر معاملہ کے جواز و عدم جواز پر نہیں پڑتا۔

یہ ایک سرسری، مختصراً اجمالی خاکہ ہے اگر کوئی جماعت اس کام کے لئے تیار ہو تو

اس پر مزید غور وفکر کر کے زیادہ سے زیادہ نافع بنانے اور نقصانات سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں سوچی جاسکتی ہیں اور سال دو سال تجربہ کر کے ان میں بھی شرعی قواعد کے ماتحت تغیر وتبدل کیا جاسکتا ہے۔

بینکنگ اور بیمہ کا موجودہ نظام بھی تو کوئی ایک سال میں قابل عمل نہیں ہوا ایک صدی سے زیادہ اس میں غور وفکر اور تجربات کی بناء پر ردوبدل کرنے کے بعد اس شکل میں آیا ہے جس پر اطمینان کیا جاسکتا ہے، اگر صحیح جذبات کے ساتھ اس کا تجربہ کیا جائے اور تجربات کے ماتحت شرعی قواعد کے ماتحت اصلاحات کا سلسلہ جاری رہے تو یقیناً چند سال میں بلاسود کی بنکاری، اور بیمہ وغیرہ کا نظام شرعی اصول پر پورے استحکام کے ساتھ بروئے کار آسکتا ہے۔

نظام مضاربت کے تحت بنکاری کا ایک لازمی اثر یہ بھی ہوگا کہ ملک کی دولت سمٹ کر چند افراد یا خاندانوں میں محصور ہوکر نہیں رہ جائے گی بلکہ تجارتی نفع کی شرح سے پوری قوم کو معتد بہ فائدہ حاصل ہوگا، اس وقت صرف اس اجمالی خاکہ ہی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
دارالعلوم کراچی ۳۰
۲۱ر شوال ۱۳۸۴ھ

●●●

جواب: مولانا ولی حسن ٹونکی

باسمہ تعالیٰ

اسلام اور بیمہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام وہ آخری پیغام ہدایت ہے جو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے سرچشمہ قانون ہے، اب خدائی ہدایت اور تشریح کا مستند ماخذ صرف اسلام ہے، آئندہ کوئی مزید ہدایت اور تشریع آنے والی نہیں ہے جس کی طرف انسان کو رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔

ایسی ہدایت ربانی میں ہماری مادی، روحانی، شخصی، اجتماعی، اقتصادی، معاشی، سیاسی غرض ہر ضرورت کا سامان موجود ہے۔

قرآن کریم نے ہدایت ربانی کے اصول وکلیات کی طرف رہنمائی کی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل اور تقریر سے ان اصول وکلیات کی تفصیلات اور جزئیات بیان فرمائیں، پھر چونکہ یہ آخری ہدایت ہے اس لئے امت محمدیہ کو اجتہاد کے شرف سے نوازا، ائمہ مجتہدین نے اپنی مقدور بھر کوششیں قرآن کریم وحدیث نبوت کے سمجھنے اور ان ہر دو چشموں سے احکام اور ان کی علل مستنبط کرنے میں صرف کیں، بالآخر ان برگزیدہ نفوس کی سعی وکوشش سے ایک عظیم ذخیرہ ظہور پذیر ہوگیا جس کو فقہ اسلامی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

فقہ اسلامی میں ہمارے اس زمانہ کی بیشتر ضروریات کا حل موجود ہے، لیکن تمدن اور صنعتی انقلاب نے اس زمانہ میں نت نئے مسائل پیدا کردیئے ہیں، معاملات، معاش اور اقتصادیات کے سلسلہ میں سیکڑوں ایسے مسائل پیدا ہوگئے ہیں جو حل طلب ہیں، اور علمائے امت کو دعوت فکر دے رہے ہیں کہ وہ فقہ اسلامی کی روشنی میں ان کا حل پیش کریں، اصل

میں تو یہ کام اسلامی حکومتوں کا تھا کہ وہ اپنے وسیع تر ذرائع ووسائل استعمال کر کے عالم اسلام کے منتخب اور مستند علماء کو جمع کرتیں اور ان کے ساتھ نئے معاملات ومسائل جاننے والے موجود ہوتے، پھر یہ حضرات قرآن کریم، حدیث نبوی اور فقہ اسلامی کی روشنی میں صحیح صحیح جوابات دیتے جاتے، اسی طرح احکام کی علتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر ان تمام معاملات میں ان کو جاری کرتے جن میں وہ علتیں فی الواقع پائی جاتی ہیں۔

لیکن تاریخ کا یہ بھی ایک عجیب المیہ ہے کہ موجودہ مسلم حکومتوں پر ایسے افراد مسلط ہیں کہ جو اپنے وسائل وذرائع کو اسلام کے احیاء اور اس کی نشأۃ ثانیہ پر صرف کرنے کے بجائے اسلام کی بیخ کنی پر خرچ کررہے ہیں، ان کی تمام تر کوششوں کا حاصل یہی ہے کہ عام مسلمانوں کو اسلام کی تعلیمات سے برگشتہ کر کے الحاد اور ذہنی آوارگی کے حوالہ کردیا جائے، اگر کسی حکومت کے زیر انصرام کوئی ایک آدھ ادارہ تحقیقات اسلام نظر بھی آتا ہے تو وہ بھی صرف اس بناء پر ہے کہ جدید اسلام کی داغ بیل ڈال کر صحیح اسلام کے نقوش مسلمانوں کے دلوں سے مٹادیئے جائیں، اس قسم کے اداروں کے مافی الضمیر کے سمجھنے کو بس اسی قدر کافی ہے کہ ان کو غذا اشتشراق کے طعام خانوں سے ملتی ہے، جن کا مقصد وحید یہی ہے کہ جو اسلام تلوار کے زور سے فتح نہیں ہوا اس کو تشکیک کی راہوں پر لا کر ختم کردیا جائے۔

دوسرے درجہ میں علمائے امت کا فریضہ تھا کہ وہ ان پیش آنے والے مسائل کا حل پیش کرتے، اجتماعی طور پر نئے مسائل میں غور وفکر کرنا اسلام کی منشاء کے عین مطابق ہے، اور سلف میں اس کی متعدد نظیریں موجود ہیں۔

ابوبکر الرازی الجصاص اپنی بے نظیر کتاب احکام القرآن میں آیت کریمہ **ولو رَدّوه إلىٰ الرسول وإلىٰ أُولىٰ الأمر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم**(۱) اور **انزلنا اليک الذکر لتبين للناس ما نزل اليهم** (۲) ذکر کر کے احکام میں غور وفکر کرنے کی اس طرح دعوت دیتے ہیں۔

(۱) سورہ نساء: ۸۳۔ (۲) سورہ نحل: ۴۴۔

(۱) ترجمہ آیت: تو تحقیق کریں ان میں تحقیق کرنے والے (۲) اور ہم نے تجھ پر یہ قرآن اتارا تا کہ تو وضاحت سے بیان کرے ان کے لئے سامنے وہ چیز جو کہ اتری ہے ان کے واسطے

فحثنا على التفكر فيه وحرضنا على الاستنباط والتدبر وامرنا بالاعتبار نتسابق إلى ادراک احكامه وننال درجة المستنبطين والعلماء الناظرين۔(۱)

اللہ تعالیٰ نے ہم کو غور وفکر کرنے پر آمادہ کیا ہے اور احکام معلوم کرنے اور ان میں تدبر کرنے کی دعوت دی ہے اور قیاس کرنے کا حکم دیا ہے تا کہ ہم اس کے احکام معلوم کرنے کی طرف پیش قدمی کریں اور احکام معلوم کرنے والے اور غور وفکر کرنے والے علماء میں شامل ہو جائیں۔

فقیہ ملت امام ابوحنیفہ غالبًا ائمہ مجتہدین میں سب سے پہلے امام ہیں جنہوں نے مسائل وواقعات میں غور وفکر کرنے کے اجتماعی طریقے کو فروغ دیا، امام ممدوح نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور شخص انتخاب کئے جن میں سے اکثر خاص خاص فنون میں جو تکمیل فقہ کے لئے ضروری ہے استاد زمانہ تسلیم کئے جاتے ہیں، مثلاً یحییٰ بن ابی زائدۃ، حفص بن غیاث، قاضی ابو یوسف، داؤد الطائی، حیان، مندل حدیث وآثار میں نہایت کمال رکھتے تھے، امام زفر قوت استنباط واستحسان میں مشہور ہیں، قاسم بن معن اور امام محمد کو ادب اور عربیت میں کمال تھا، امام اعظم نے ان حضرات کی شرکت سے ایک مجلس مرتب کی اور مسائل پر غور وفکر شروع کیا، امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ابوحنیفہ کے تلامذہ جنہوں نے فقہ کی تدوین کی اور اس عظیم کام میں امام صاحب کے شریک رہے چالیس تھے۔

جب بیع الوفاء کا بخارا اور اس کے اطراف میں رواج شروع ہوا چونکہ یہ قمار کی

(۱) احکام القرآن للجصاص ۲/ ۴۷۷۔

ایک نئی صورت تھی، اس وقت علماء نے اس کے سلسلہ میں غور وفکر کی راہ نکالی۔

قلت للإمام أبی الحسن الماتريدی قد فشی صور البيع بين الناس وفيه مفسدة عظيمة وفتواک أنه رهن وانا ايضا على ذالک ، فالصواب ان تجمع الائمة وتتفق على هذا و نظيره بين الناس.(۱)

میں نے امام ابوالحسن ماتریدی سے عرض کیا کہ بیع بالوفاء کا رواج عام ہو گیا ہے، اور اس میں بڑی خرابی ہے آپ کا فتویٰ یہ ہے کہ یہ رہن کے حکم میں ہے میرا بھی یہی خیال ہے، لہٰذا بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ علمائے کبار کو جمع کریں اتفاق رائے سے مسئلہ لوگوں کے سامنے ظاہر کریں۔(۲)

قابل مبارک باد ہیں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے منتظمین کہ انہوں نے اس ملی ضرورت کو محسوس کیا اور ایک مجلس بنام ''مجلس تحقیقات شرعیہ'' تشکیل کی جس کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسائل جدیدہ میں علماء غور وفکر کریں اور ایک متفقہ فیصلہ عوام کے سامنے پیش کریں، چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ''بیمہ'' کے بارے میں ایک تفصیلی سوالنامہ ہے جس کو بڑی قابلیت سے مرتب کیا گیا ہے، اس سوال نامہ کا پورا متن ماہنامہ ''بینات'' بابت ماہ شعبان میں شائع ہو چکا ہے، اس سوال نامہ کا تفصیلی جواب دینے سے پہلے بیمہ کے آغاز وانجام پر ایک نظر ڈال لینا چاہئے۔

(۱) جامع الفصولین ۱/۲۲۴۔

(۲) بیع الوفاء کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے کہے کہ میں نے تم کو یہ مکان مثلاً فروخت کر دیا اور پھر شرط طے کر لے اور تحریر لکھا لے کہ جب میں قیمت ادا کر دوں تو تم کو مکان واپس کرنا ہوگا، اس بیع کے بارے میں فقہاء کا شدید اختلاف ہے، بعض رہن کہتے ہیں اور بعض بیع، پھر یہ بیع صحیح ہے یا فاسد، فتویٰ یہی ہے کہ بیع ہے کیونکہ بیع وشراء کے الفاظ پائے جاتے ہیں، اگر بیع کے اندر واپسی کی شرط کی گئی تو بیع فاسد ہے، اور اگر ایجاب وقبول کے بعد شرط واپسی کی گئی تو بیع صحیح ہے اور یہ شرط ایک وعدہ ہے جس کی وجہ سے بیع میں کوئی خرابی نہیں آتی ہے۔

بیمہ کا آغاز وانجام

کہا جاتا ہے کہ بیمہ کی ابتداء اٹلی کے تاجران اسلحہ سے ہوئی، ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ بعض تاجروں کا مال تجارت سمندر میں ضائع ہو جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ انتہائی تنگدستی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں، اس صورت حال کا حل یہ نکالا گیا کہ اگر کسی شخص کا مال تجارت سمندر میں ضائع ہو جائے تو تمام تاجر مل کر اس کی معاونت کے طور پر اسے ہر ماہ یا ہر سال ایک معین رقم ادا کریں، یہی چیز ترقی کر کے جہازوں کے بیمہ تک پہنچی کہ ہر ایک ممبر مقررہ رقم ادا کرے اس قسم کے حوادث وخطرات کے موقعہ پر نقصان کا کچھ نہ کچھ تدارک کیا جا سکے۔

یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ سب سے پہلے اندلس کی مسلم حکومت کے دور میں بحری تجارت میں حصہ لینے والے مسلمانوں نے تجارتی بیمہ کی طرح ڈالی، ابتداء میں بیمہ کی شکل سادہ تھی، بعد میں اس کی نئی نئی صورتیں نکلتی رہیں اور تجربے ہوتے رہے، ہالینڈ اس تجربہ میں پیش پیش رہا، موجودہ دور میں ایک مقررہ قسط پر بیمہ کاری کا نظام سب سے زیادہ مقبول ہے جس کو سرمایہ کارانہ نظام بیمہ کہا جاتا ہے، اب دنیا کی حکومتیں بیمہ کو لازمی قرار دے رہی ہیں، جس کو سیاسی بیمہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، بیمہ کی ابتداء چودھویں صدی عیسوی میں بتلائی جاتی ہے، ابتداء ہوتے ہی اس کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا اور اس کے مقدمات اس کثرت سے عدالتوں میں آنے لگے کہ ۱۴۳۵ء میں اس کے لئے خاص عدالتیں مقرر کی گئیں جو صرف بیمہ کے مقدمات سماعت کریں، بیمہ بحری کے بہت عرصہ بعد بیمہ بری شروع ہوا۔

سلطنت آل عثمان کے زمانہ میں جب حکومت ترکی کے تجارتی تعلقات یورپ کے ملکوں سے قائم ہوئے تو یوروپین تاجروں کے توسط سے بیمہ اسلامی ملکوں میں داخل ہوا اور اس کے سلسلہ میں علمائے وقت سے استفسارات شروع ہوئے، چنانچہ تیرہویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین ''ردالمحتار'' میں تحریر کرتے ہیں:

وبما قررناه يظهر جواب ما كثر السوال عنه في زماننا وهو انه جرت العادة ان التجار اذا استاجروا مركبا من حربي يدفعون له اجرته ويدفعون ايضا مالا معلوماً لرجل حربي مقيم في بلاده يسمى ذلك المال سوكرة على انه مهما هلك من المال الذي في المركب بحرق او غرق او نهب او غيره فذلك الرجل ضامن له بمقابلة ما ياخذه منهم وله وكيل عنه مستامن في دارنا يقيم في بلاد السواحل الاسلامية باذن السلطان يقبض من التجار مال السوكرة واذا هلك من مالهم في البحر شيئي يودي ذلك المستامن للتجار بدله تماماً. (۱)

اور ہماری اس تقریر سے اس سوال کا جواب بھی ظاہر ہو گیا جس کے بارے میں آج کل کثرت سے سوالات کئے جا رہے ہیں اب طریقہ یہ ہو گیا ہے کہ تاجر جب کسی حربی (۲) سے کوئی بحری جہاز کرایہ پر لیتے ہیں تو اس کا کرایہ ادا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ دارالحرب کے باشندہ کو جو اپنے علاقہ میں مقیم رہتا ہے کچھ رقم اس شرط پر دے دیتے ہیں کہ جہاز میں لدے ہوئے مال کے آتش زدگی، غرقابی اور چوری ہو جانے کی صورت میں یہ شخص ضامن ہوگا اور اس رقم کو سوکرہ (بیمہ کی رقم) کہا جاتا ہے، اس کا ایجنٹ ہمارے ملک کے ساحلی شہروں میں شاہی اجازت نامہ کے بعد مستامن (۳) بن کر رہتا ہے جو تاجروں سے بیمہ کی رقوم وصول کرتا ہے اور مال کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں تاجروں کا پورا پورا معاوضہ ادا کرتا ہے۔

علامہ موصوف کے فتویٰ کو تو ہم بعد میں ذکر کریں گے لیکن عبارت مندرجہ بالا سے معلوم ہوا کہ بیمہ بحری کو اس زمانہ میں اچھا خاصا فروغ ہو چکا تھا، یورپی ملکوں سے جو جہاز کرایہ پر لئے جاتے تھے ان کا لازمی طور پر بیمہ کرایا جاتا تھا، بیمہ کمپنیوں کا عمل دخل ترکی

(۱) ردالمحتار باب المستأمن ۳/۳۴۵۔ (۲) حربی دارالحرب کے باشندے کو کہتے ہیں۔

(۳) مستامن وہ شخص جو میعادی اجازت کے بعد دارالحرب سے دارالاِسلام آیا ہو یا دارالاِسلام سے تجارت وغیرہ کی غرض سے دارالحرب گیا ہو۔

حکومت میں جاری تھا، بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ ترکی کی بندرگاہوں پر باضابطہ سلطانی اجازت کے بعد مقیم تھے اور انہوں نے اپنے دفاتر قائم کر لئے تھے یہاں تک کہ علمائے وقت کے پاس اس بارے میں کثرت سے سوالات آنے لگے، کتب فتاویٰ (۱) میں ردالمحتار غالباً پہلی کتاب ہے جس میں بیمہ کے بارے میں تفصیل سے جواب دیا گیا ہو۔

بیمہ کی ابتداء جس جذبہ کے ماتحت ہوئی اور جس طرح وہ ارتقاء کے مختلف ادوار سے گذرا وہ سب کے سامنے ہے لیکن اس کا انجام فاضل جلیل استاذ ابوزہرہ کے الفاظ میں قابل ملاحظہ ہو:

''اگرچہ اس کی اصلیت تعاون محض تھی لیکن اس کا انجام بھی ہر اس ادارہ کا سا ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا کہ یہودیوں نے اس نظام کو جس کی بنیاد تعاون علی البر والتقویٰ تھی ایک ایسے یہودی نظام میں تبدیل کر دیا جس میں قمار (جوا) اور ربوا (سود) دونوں پائے جاتے ہیں۔''(۲)

بیمہ کے سلسلہ میں ہندو و پاک میں اجتماعی رائے حاصل کرنے کی باقاعدہ کوشش تو یہی نظر آتی ہے جو مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے شروع کی ہے لیکن مصر و شام میں اس پر علمی بحثیں مدت سے جاری ہیں، وہاں بیمہ کے نظام کو سمجھانے کے لئے کئی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔(۳)

مصر میں تین چار سال قبل مسائل جدیدہ پر غور وفکر کرنے کے لئے ایک مجلس ترتیب دی گئی جس میں استاذ ابوزہرہ، استاذ خلاف، اور دیگر علماء شریک ہوئے، اس کے پہلے جلسہ میں جو مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا، بیمہ کا مسئلہ

(۱) امداد الفتاوی وفتاوی دارالعلوم دیوبند میں بھی اس کے متعلق جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۲) لواء الاسلام بحوالہ ماہنامہ برہان دہلی ماہ مارچ ۶۰ھ۔

(۳) ڈاکٹر محمد علی عرفہ کی ''عقد التأمین'' اور ڈاکٹر سعد واصف کی ''مالتأمین من المسؤلیۃ'' خاصی مشہور ہیں، شام کے مشہور فاضل اور ''المدخل الفقہی العام'' کے مصنف مصطفیٰ الزرقاء نے نظامی بیمہ کو سمجھنے کے لئے انہی دونوں کتابوں کو مدار بنایا ہے۔

پیش کیا گیا، اس جلسہ کی پوری روئیداد مجلّہ لواء الاسلام قاہرہ میں چھپی تھی (۱) پھر شام کے مشہور فاضل مصطفیٰ الزرقاء نے مجلّہ حضارۃ الاسلام (دمشق) کے صفحات پر ''عقد التامین وموقف الشریعۃ'' کے عنوان سے بحث چھیڑی اور علماء کو دعوت دی کہ وہ اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کریں، چنانچہ استاذ ابوزہرہ نے استاذ الزرقاء کے جواب میں نہایت مدلل مقالہ سپرد قلم فرمایا۔

استاذ الزرقاء کے مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علمائے مصر و شام، اس مسئلہ میں مختلف الخیال ہیں اگرچہ اکثریت کا یہی خیال ہے کہ بیمہ ناجائز ہے، اور جب تک بیمہ کے موجودہ نظام کو تبدیل نہ کیا جائے مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں، مختلف الخیال حضرات کی آراء اور ان کے دلائل کا خلاصہ ذیل میں درج ہے:

ایک مختصر سی تعداد کا خیال ہے کہ ہر قسم کا بیمہ جائز ہے یہ حضرات بیمہ کے موجودہ نظام کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی حلت اور جواز کے قائل ہیں ان حضرات کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے۔

(الف) بیمہ امداد باہمی کی ایک شکل ہے، تعاون اور امداد باہمی اسلامی حکم ہے

(ب) جس طرح بیع الوفاء (۲) کو فقہاء نے گوارا کر لیا اسی طرح اس کو بھی گوارا کر لیا جائے

(ج) بیمہ کمپنی ضرورت مندوں کو جو قرض دیتی ہے اور اس پر سود لگاتی ہے یا بیمہ دار کو اصل مع منافع دیا جاتا ہے وہ شرعی ربوا (سود) نہیں ہے۔

دوسرا گروہ جس کی قیادت استاذ الزرقاء کے ہاتھ میں ہے اس کا خیال ہے کہ غیر سودی بیمہ جائز ہے، بیمہ میں اگر کوئی قباحت ہے تو وہ سود ہے، اس کو ختم کرنے کے بعد بیمہ کی ہمہ اقسام جائز ہیں، ان حضرات کے دلائل کا تجزیہ اس طرح کیا جا سکتا ہے۔

(الف) عقد موالاۃ (۳) پر قیاس کہ اس میں ایک غیر شخص دیت وغیرہ کی ذمہ داری قبول

(۱) اس کا اردو ترجمہ ماہنامہ برہان دہلی بابت ماہ مارچ ۶۰ھ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۲) اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ (۳) عقد مؤالات کی صورت یہ ہوتی ہے آپس میں دو آدمیوں کے درمیان معاہدہ ہو جاتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے وارث بھی ہوں گے اور ضمان بھی برداشت کریں گے۔

کرلیتا ہے،اوراس کے معاوضہ میں میراث کا حقدار ہوتا ہے،اسی طرح بیمہ کو بھی سمجھ لیا جائے۔

(ب) ودیعۃ (۱) باجر اور مسئلہ ضمان (۲) خطر الطریق میں بیمہ کی بعض صورتوں کو داخل کیا جاسکتا ہے۔

(ج) مالکیہ کے نزدیک اگر کوئی کسی سے وعدہ کرے بدون کسی عقد کے تو وہ وعدہ لازم ہوجاتا ہے،نقصان کی صورت میں وعدہ کرنے والے پر معاوضہ نقصان ضروری ہوتا ہے۔(۳)

تیسرا اگر وہ جس کی قیادت استاذ ابوزہرہ کے ہاتھ میں ہے،اس کا قائل ہے کہ بیمہ مطلقاً ناجائز ہے،خلاصہ دلائل یہ ہے(۱) بیمہ اپنی اصل وضع میں یا تو قمار ہوتا ہے جب کہ مدت مقررہ کے اختتام کے قبل ہی بیمہ دار کی موت واقع ہوجائے یا ربوا ہوتا ہے جب کہ کل اقساط کی ادائیگی کے بعد بیمہ دار بیمہ شدہ رقم مع منافع حاصل کرتا ہے، قمار اور ربوا دونوں حرام ہیں۔(۲) اس میں صفقتان فی صفقۃ پایا جاتا ہے(۴)، اس کی ممانعت بنص حدیث ثابت ہے اور ائمہ اربعہ کا اتفاق واجماع ہے(۳) نظام میراث کا درہم برہم ہوجانا کیونکہ بیمہ دار کے نامزد کردہ شخص کو بیمہ کی رقم دی جاتی ہے جب کہ ہر شرعی وارث مال متروکہ کا حقدار ہوتا ہے(۴) عقد صرف (۵) ہے جس میں مجلس میں قبضہ ضروری ہے اور

(۱) ''ودیعۃ باجر'' کی صورت یہ ہے کہ اپنے مال کو کسی دوسرے کے پاس امانت رکھا جائے اور حفاظت امانت کی اجرت مقرر کردی جائے اس صورت میں مال ضائع ہوجائے تو امین ضامن ہوتا ہے اور نقصان کا مواخذہ اس کے ذمہ واجب ہے۔ (۲) اس کی شکل یہ ہے کہ ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس راستہ پر سفر کرو، راستہ قابل اطمینان ہے اور اگر راستہ قابل اطمینان نہ ہو اور تمہارا مال چھین لیا گیا تو میں ضامن ہوں، راستہ میں مال چھین لیا گیا، تو وہ ضامن ہوگا اور تلافی نقصان کرے گا۔ (۳) یہ مسئلہ مالکیہ کے نزدیک بھی اتفاقی نہیں ہے، تین قول ہیں ایک قول وہی جو اوپر مذکور ہوا، فتح العلی المالک ص ۲۵۵۔ (۴) یعنی ایک معاملہ کے ختم ہونے سے پہلے اس میں دوسرا معاملہ داخل کردیا جائے۔ (۵) عقد صرف روپئے کی بیع روپے سے یا سونے چاندی کی آپس میں بیع کو کہتے اس میں شرط ہے کہ معاملہ کرنے والے مجلس ختم ہونے سے پہلے مال پر قبضہ کرلیں۔

یہاں یہ شرط مفقود ہے(۵) عقیدہ تقدیر پر ایمان کا تقاضا ہے کہ پیش آنے والے حوادث اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیئے جائیں اور یہاں بیمہ کرانے والے اس عقیدہ سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں کیونکہ وہ پہلے سے حوادث وموت کی پیش بندیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بیمہ کے بارے میں علامہ ابن عابدین کا فتویٰ:

اب یہاں ہم علامہ ابن عابدین الشامی کے فتویٰ کی تلخیص درج کرتے ہیں، واضح رہے کہ یہ مسئلہ ''مستامن'' کے باب میں ذکر کیا گیا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ تاجروں کو ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ التزام مالا یلزم (۱) کی صورت ہے، اگر یہ کہا جائے کہ امانت رکھنے والا، امانت کی حفاظت پر اجرت لے لے اور امانت ضائع ہوجائے تو وہ ضامن ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ بیمہ کے مسئلہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہاں مال بیمہ کمپنی کی تحویل میں نہیں ہوتا بلکہ بحری جہاز کے مالک یا اس کے ملازم کی حفاظت میں ہوتا ہے اور اگر یہ صورت ہو کہ بیمہ کمپنی کا جہاز بھی ہو تب بھی ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہوگا (۲) کیونکہ اس صورت میں بیمہ کمپنی اجیر مشترک سمجھی جائے گی جس نے حفاظت مال اور مال لے جانے دونوں کی اجرت لی ہے اور ظاہر ہے کہ اجیر مشترک ناگہانی آفات سے مال تلف ہوجانے کی صورت میں ضامن نہیں ہوتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ باب الکفالۃ میں ایک مسئلہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے کہا کہ اس راستہ پر سفر کرو، راستہ قابل اطمینان ہے۔

شخص مذکور نے راستہ پر سفر کیا، سفر میں مال ضائع ہوگیا تو اطمینان دلانے والا شخص ضامن نہیں ہوگا، برخلاف اس کے اگر اس نے ضمانت کے الفاظ بولے اور کہا کہ تیرا مال چھینے جانے کی صورت میں میں ضامن ہوں، راستہ میں مال چھین لیا گیا تو ضمانت

(۱) جو چیز قانوناً لازم نہ ہو اس کو اپنے ذمہ لازم کرلینا۔

(۲) بعض فقہاء کے نزدیک یہ صورت ناجائز ہے مولانا تھانویؒ نے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

دینے والا نقصان کا معاوضہ دے گا، شارح یعنی صاحب درمختار (۱) نے دونوں مسئلوں میں فرق اس طرح کیا کہ دوسرے مسئلہ میں ضمانت کے الفاظ صراحۃً پائے جاتے ہیں کیونکہ ''أنا ضامن'' (میں ضامن ہوں) لفظوں میں موجود ہے اور پہلے مسئلہ میں اس طرح نہیں ہے، جامع الفصولین (۲) میں وجہ فرق اس طرح بیان کیا ہے:

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ غرر (۳) میں آنے والا، غرر دینے والے سے ضمان اس وقت لے گا جب کہ غرر کسی عقد معاوضہ کے ضمن میں پایا جائے، یا دھوکا دینے والا دھوکہ دیئے ہوئے شخص کے حق میں صفت سلامتی کا ضامن ہو مثلاً ایک شخص کسی چکی والے کے پاس گیہوں پسانے کے لئے لایا، چکی والے نے اس سے کہا کہ اس برتن میں ڈال دو اتفاق سے برتن میں سوراخ تھا اور چکی والا اس سے واقف بھی تھا تب بھی اس نے گیہوں برتن میں ڈالنے کے لئے کہا، گیہوں سب ضائع ہوگئے، چکی کا مالک نقصان کا ضامن ہوگا، کیونکہ اس نے عقد اجارہ کے ذیل میں دھوکہ دیا حالانکہ معاملہ کا تقاضہ یہ تھا کہ مال کی حفاظت رہے۔

(۱) تنویر الابصار ایک متن ہے جو شیخ الاسلام محمد بن عبداللہ التمر تاشی کی تصنیف ہے، اس کی شرح شیخ محمد بن علی بن محمد الحصکفیؒ نے پہلے تو خزائن الاسرار و بدائع الافکار کے نام سے تالیف فرمائی جس کی شرح ابواب الوتر تک دس ضخیم جلدوں میں پہنچ چکی تھیں، یہ شرح ناتمام رہی پھر دوسری شرح الدر المختار کے نام سے تالیف فرمائی، اس شرح کا حاشیہ علامہ ابن عابدین الشامی نے رد المحتار کے نام سے تحریر کیا، جو علماء کے درمیان متداول و معروف ہے۔

(۲) اس کے مولف شیخ بدرالدین محمود بن اسماعیل ہیں، قاضی سماوہ کے نام سے مشہور ہیں، یہ کتاب صرف معاملات میں ہے۔

(۳) غرر=غرور کے معنی ہیں کسی کو دھوکہ دینا اور غلط طریقہ سے اس کو طمع میں ڈالنا، دھوکہ دینے والے کو غار اور دھوکہ کھانے والے کو مغرور کہتے ہیں، غرر کی دو صورتیں ہیں۔

غرر قولی یعنی زبان سے معاملہ میں دھوکہ دے مثلاً کہے کہ یہ بکری دو سیر دودھ دیتی ہے اور وہ نہ دیتی ہو۔ غرر فعلی یعنی فعل سے دھوکہ دینا، جیسے گیہوں فروخت کرنے والا خراب گیہوں نیچے کر دے اور اچھے گیہوں اوپر کر دے، واضح رہے کہ غرر، خطر کے معنی میں بھی فقہ کی زبان میں بولا جاتا ہے، یعنی ملک کو ایسی چیز پر موقوف کرنا جس کے پائے جانے یا نہ پائے جانے دونوں کا احتمال ہو جس طرح کہ قمار (جوا) میں ہوتا ہے، قمار کی علت غرر اور خطر فقہ کی زبان میں بتلائی جاتی ہے

میں کہتا ہوں کہ مسئلہ میں یہ قید ضروری ہے کہ دھوکہ دینے والا نقصان سے واقف ہو اور دوسرا اس سے واقف نہ ہو..... اب ظاہر ہے کہ بیمہ کمپنی کا مقصد تاجروں کو دھوکہ دینا نہیں ہوتا اور نہ ان کو جہاز کے ڈوب جانے یا آگ لگنے وغیرہ کا علم ہوتا ہے، رہا عام خطرہ تو وہ تاجر اور بیمہ کمپنی دونوں کو ہوتا ہے، کیونکہ تاجر بیمہ کراتے ہی اس وقت ہیں جب ان کو خطرہ ہو اور ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینے کی طمع ہو لہٰذا بیمہ کے مسئلہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ (۱)

البتہ اگر مسلمان تاجر کا کوئی حربی شریک ہو اور وہ دارالحرب میں بیمہ کمپنی سے معاملہ طے کرے اور مال ہلاک ہونے کی صورت میں معاوضۃ کی رقم میں کچھ مسلمان تاجر کا بھی حصہ لگا لے تو یہ رقم مسلمان کے لئے حلال ہے کیونکہ عقد فاسد دارالحرب میں رہنے والے دو شخصوں کے درمیان ہوا ہے اور دارالحرب والوں کا مال ان کی رضامندی سے مسلمان کو پہنچا ہے، لہٰذا اس کے لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مسلمان تاجر دارالحرب میں ہوتا اور وہاں ان کے ساتھ یہ معاملہ طے کرتا ہے اور معاوضہ دارالاسلام میں لیتا ہے، کبھی اس کے برعکس بھی صورت ہوتی ہے یعنی معاملہ دارالاسلام میں طے ہوا، اور وصولی دارالحرب میں ہوئی، پہلی صورت میں معاوضہ لینا جائز ہے، کیونکہ دارالحرب میں طے کیا ہوا معاملہ کالعدم سمجھا جائے گا اور یہ کہیں گے کہ حربی کا مال اس کی خوشی سے لیا گیا ہے اس لئے جائز ہے، دوسری صورت میں عقد چونکہ دارالاسلام میں قرار پایا ہے، اس لئے عقد پر فساد کا حکم لگایا جائے گا اور معاوضہ لینا ناجائز متصور ہوگا۔

جواب کی طرف.....

اب ہم اصل سوالنامہ کے جواب کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہم اپنے جواب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، پہلے حصہ کا تعلق نظام بیمہ کی اصلاح سے ہے، اس طرح کہ وہ شریعت اسلامیہ کے مطابق ہو جائے، تعاون علی الخیر کا یہ نظام جواب قمار (جوا) اور ربوا کا

(۱) علامہ شامی کے زمانہ میں سودی بیمہ نہیں ہوتا تھا اس لئے سود سے بحث نہیں کی۔

مجموعہ نظر آتا ہے، اپنی اصل شکل میں ظاہر ہو کر ان لوگوں کے لئے قابل قبول ہو جو اپنے معاملہ کو اسلام کی ہدایت اور روشنی سے درخشاں رکھنا چاہتے ہیں۔

بعض اسلامی ملکوں میں اب اس قسم کی فکر ہو رہی ہے کہ سودی نظام سے جس نے ہماری معاشی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے اور جس نے قوم کی اجتماعی دولت کو گھن کی طرح کھا لیا ہے، گلو خلاصی کی کوئی صورت نکلے اسی طرح بیمہ کی اصلاح اور اس کو صحیح خطوط پر لانے کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے، یہ جذبہ بڑا قابل قدر ہے اور ضرورت ہے کہ اقتصادیات کے منتخب ماہرین ارباب بصیرت علماء کے ساتھ بیٹھ کر حلال وحرام کی حدیں پیش نظر رکھ کر بیمہ کاری کا ایسا نظام دریافت کریں جس میں شریعت محمدیہ سے سرمو تجاوز نہ ہو، عام مسلمانوں سے بھی ہماری گذارش ہے کہ وہ اپنی حکومتوں پر جو اسلام کا نام لیتی ہیں، زور دیں اور ان پر اجتماعی وزن ڈالیں کہ وہ ان کو سود اور قمار کی لعنت سے نجات دلائیں، ان سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ اس یہودی نظام نے ہماری دنیا بھی خراب کر رکھی ہے اور آخرت بھی، یہ طریق کار صحیح نہیں ہے کہ ماہرین شریعت کی طرف رجوع کر کے ان سے کہا جائے کہ وہ بیمہ کو حلال کر دیں یا ضرورت ومجبوری کے لئے کوئی حیلہ لگا لیں۔

ان علماء کا کردار بھی قابل مذمت ہے جو یورپ کے ہر اقتصادی نظام کی چند خوبیاں یا خوشنما باتوں کو دیکھ کر جواز اور حلت کا فتویٰ دینے میں نہایت جری ہیں، ان حضرات کو قرآن کریم کی آیت کریمہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔

ولا تقولوا لما تصف السنتكم الكذب هذا حلال وهذا حرام لتفتروا على الله الكذب، ان الذين يفترون على الله الكذب لا يفلحون. (۱)

اور نہ کہو اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تا کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھو، بلاشبہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر بہتان

(۱) النحل، رکوع ۲۰/۱۴۔

باندھتے ہیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

مجوزین کے دلائل کا خلاصہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، دلائل کی سطحیت بالکل ظاہر ہے، مثلاً اس دلیل کو آپ کیا کہیں گے کہ بیمہ کا سود حلال ہے کیونکہ قرض میں سود نہیں ہوتا، ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن کریم کی آیت ربوا تجارت اور قرض کے جاہلی نظام کو ختم کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی، جاہلی نظام میں قرض اور تجارت کے ذریعہ سود لیا جاتا تھا، امام ابوبکر الجصاص الرازی احکام القرآن میں لکھتے ہیں:

والثانی انه معلوم ان ربوا الجاهلية انما كان قرضا موجلاً بزيادة مشروطة فكانت الزيادة بدلاً من الاجل فابطله الله وحرمه. (۱)

دوسری بات یہ ہے کہ یہ امر بالکل عیان ہے کہ زمانہ جاہلیت کا سود قرض میعادی کی شکل میں لیا جاتا تھا، جس میں زیادتی شرط کر لی جاتی تھی، زیادتی میعاد کا بدل ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو باطل قرار دیا اور یہ حرام فرمایا۔

مغنی ابن قدامہ میں ہے کہ امام احمد بن حنبل سے سوال کیا گیا کہ وہ کونسا ربا ہے جس کے انکار سے کفر لازم آتا ہے، امام موصوف نے جواب دیا

''الزيادة فى الدين'' (قرض میں زیادتی)۔ (۲)

ربوا کے بارے میں احادیث نبویہ کا حاصل یہی ہے کہ ربوا صرف روپے کے لین دین تک محدود نہیں ہے بلکہ ربوا کے سلسلہ میں بہت سی صورتیں داخل ہیں حتی کہ ان صورتوں کو بھی حرام کر دیا گیا جن میں ادھار نہیں ہے، بلکہ نقد معاملہ ہے مثلاً ایک تولہ چاندی لے کر کوئی دو تولہ چاندی دے دے یا ایک من نقد گیہوں دے کر اس کے معاوضہ میں دو من گیہوں نقد

(۱) احکام القرآن ۱/۵۵۴۔

(۲) دین کا ترجمہ قرض کے ساتھ نامکمل سا ہے، کیونکہ دین ماثبت فی الذمہ (جو انسان کے ذمہ میں آجائے) کو کہتے ہیں، اس میں بدل قرض، ثمن مبیع وغیرہ سب داخل ہیں، شریعت کی اس اصطلاح کے نہ جاننے سے بھی لوگ عجیب قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

لے لے (۱) الغرض حدیث پاک نے ربوا کے ریشے بھی اسلام کے معاشی نظام سے نکال کر پھینک دیئے تا کہ اسلامی معاشرہ اس نجاست سے بالکل صاف و پاک ہو جائے۔

فقہ حدیث کی شرح ہے جس طرح حدیث قرآن کریم کی، اس لئے فقہاء کرام نے ان ہی صورتوں کی تفصیلات مرتب کیں جو حدیث میں بیان کی گئی ہیں، اس سے فقہ کی کتابوں میں سود کے مباحث کو دیکھ کر بعض نام نہاد علماء اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ قرآن نے جس سود کو حرام کیا ہے وہ قرض والا سود نہیں ہے بلکہ خرید و فروخت کی چند نادر شکلوں میں سود پایا جاتا ہے جو ایام جاہلیت میں مروج نہیں اور جن کا ذکر فقہ کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔

بعض نے **تعاونوا علی البر والتقویٰ** اور **لا یظلمون ولا یظلمون** (۲) اس قسم کی عمومی آیات سے استدلال کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات ربوا اور میسر (جوا) کی آیات کو بالکل بھول گئے ہیں، دلائل خصوص کے ہوتے ہوئے دلائل عموم سے سہارا لینا قابل تعجب ہے۔

بیمہ کس لئے:

شروع میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ بیمہ کی ابتداء نہایت سادہ تھی اور اس کا مقصد بھی صرف یہ تھا کہ نقصان زدہ تاجروں کو مالی امداد دی جائے، یا اس طرح کہہ لیجئے کہ ایک فرد کی مصیبت بہت سے افراد پر پھیلا دی جائے اس طرح کہ ہر ایک کو ایک خفیف سی قربانی دینا پڑے لیکن اس قربانی کے عوض جملہ افراد کو مصیبت و آفت کے وقت تعاون حاصل ہو، تعاون علی الخیر کا یہ جذبہ بڑا قابل قدر ہے، قرآن کریم نے اس جذبہ کو متعدد آیات میں ابھارا ہے اور حدیث نبوی میں اس کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) اس کو اس طرح سمجھ لیجئے کہ ایک من عمدہ گیہوں کے بدلے دو من خراب گیہوں لے لے یہ بھی ناجائز ہے، کیونکہ اموال ربویہ (جس میں ربوا ہوتا ہے) میں برابری ضروری ہے خواہ صفت میں تفاوت ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) فتاوی شلتوت ۳۵۰-۳۵۲۔

بیمہ کرانے والے شخص کے پیش نظر دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کے انتقال کے بعد اس کے بیوی، بچوں کو تکلیف اٹھانا نہ پڑے، اس مقصد کو بھی ہم اسلامی نقطہ نگاہ سے غلط نہیں کہہ سکتے، بلکہ تعلیم نبوی اس کو صحیح اور بہتر قرار دے رہی ہے، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

انک ان تدع ورثتک اغنیاء خیر من ان تدعهم عالةً یتکففون الناس. (۱)

تمہارا اپنے ورثہ کو غنی چھوڑنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ان کو ایسا محتاج چھوڑو کہ وہ لوگوں سے سوال کرتے پھریں۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

إن امرکن مما یهمنی من بعدی. (۲)

تمہارے معاملہ نے مجھ کو فکر میں ڈال رکھا ہے کہ تمہاری گذر میرے بعد کیونکر ہوگی (یعنی میں نے کوئی میراث نہیں چھوڑی ہے اور تم نے دنیا پر آخرت کو ترجیح دی ہے)

اپنے دنیا سے چلے جانے کے بعد بیوی بچوں کی فکر ایک فطری داعیہ ہے اس لئے اسلام نے اس کو ختم نہیں کیا بلکہ اس کی ہمت افزائی کی، اسلام کی عادت ہے کہ وہ فطری اور اور جبلی دواعی کو ختم نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے مناسب اور جائز راہیں تجویز کرتا ہے۔

بیمہ کا شرعی حل

طالب بیمہ کے حسب ذیل مقاصد بیان کئے جاتے ہیں (۱) اس کا سرمایہ محفوظ رہے (۲) اضافہ مال بذریعہ سود یا تجارت (۳) حوادث کی صورت میں مالی معاونت،

(۱) بخاری: ۵۳۵۴۔ (۲) مشکاۃ المصابیح ۲/ ۵۶۷۔، حدیث نمبر ۶۹۹۵ و ۳۷۴۹ صحیح ابن حبان، ترمذی وغیرہ میں الفاظ کے فرق کے یہ موجود ہے۔

موجودہ زمانہ میں حوادث میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے، آئے دن ہولناک قسم کے حوادث ہوتے رہتے ہیں جن میں جانی اور مالی دونوں قسم کے حوادث سے بے اندازہ نقصان ہوتا ہے (۴) پس ماندگان کی مالی امداد۔

اب ان کا ترتیب وار حل درج ہے:

(۱و۲) ان دونوں باتوں کا حل یہی ہے کہ غیر سودی بینک جاری کئے جائیں جن کی اساس شرکت (۱) اور مضاربت (۲) پر قائم کی جائے اس طرح سرمایہ کی حفاظت بھی ہوگی اور مال میں بھی جائز طریقوں پر اضافہ ہوتا رہے گا، اسلام کے معاشی نظام کا جس شخص نے بغور مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اسلام ارتکاز دولت کا قائل نہیں ہے کہ روپیہ ایک جگہ جمع کر دیا جائے اور بلا تجارت اس سے منافع حاصل کیا جائے، روپیہ سے روپیہ حاصل کرنا اسلام کے نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے، سرمایہ میں جو لوگ اضافہ چاہتے ہیں، ان کے لئے تجارت کی شاہراہ کھلی ہوئی ہے، تجارت سے سرمایہ دار کا بھی فائدہ ہے کہ سرمایہ میں اضافہ ہوتا رہے گا اور زکوٰۃ دولت کو ختم نہیں کرے گی اور ملک وقوم کا بھی فائدہ ہے کہ تجارت کو فروغ ہوگا، سرمایہ تجوریوں سے نکل کر منڈیوں اور بازاروں میں پہنچے گا، صنعت اور انڈسٹری کی کثرت ہوگی، مزدوروں اور ملازمت پیشہ لوگوں کو کام ملے گا، واضح رہے کہ اسلام اپنے معاشی نظام کی بنیاد زکوٰۃ پر رکھتا ہے، برخلاف سرمایہ دارانہ نظام کہ وہاں سود ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتا ہے، قرآن کریم نے اسلام کے معاشی نظام کو مختصر سے مختصر لفظوں میں اس طرح سمجھایا ہے۔

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء (۳) تاکہ نہ آئے لینے دینے میں صرف دولتمندوں کے تم میں سے۔

آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ یہ مصارف (اس سے پہلے مصارف بتلائے گئے

(۱) سرمایہ اور کام مشترک ہو اس کو شرکت کہتے ہیں، اس کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً شرکت عقد، شرکت ملک۔

(۲) ایک کا سرمایہ ہو دوسرے کا کام اور محنت ہو، اس کو مضاربت کہتے ہیں، تفصیلات کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

(۳) الحشر، پارہ: ۲۸۔

ہیں) اس لئے بتلائے ہیں کہ ہمیشہ یتیموں محتاجوں، بیکسوں اور عام مسلمانوں کی خبر گیری ہوتی رہے اور عام اسلامی ضروریات سرانجام پاسکیں یہ اموال محض دولتمندوں کے الٹ پھیر میں پڑ کر ان کی مخصوص جاگیر بن کر نہ رہ جائیں جس سے صرف سرمایہ دار اپنی تجوریوں کو بھرتے رہیں اور غریب فاقوں سے مریں۔

غیر سودی بینک کا اجراء کوئی تخیلی چیز نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جس کو بڑی آسانی سے عمل میں لایا جاسکتا ہے (۱) یورپ کی ذہنی غلامی نے دماغوں پر یہ عقیدہ مسلط کر دیا ہے کہ سود کے بغیر معاشی نظام چل ہی نہیں سکتا، ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ آج بھی کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں سودی نظام اور بینکنگ کا سارا کاروبار نہیں ہے اور بایں ہمہ وہ ممالک ترقی کی راہ پر گامزن ہیں بلکہ ان کی معاشی حالت سودی ملکوں سے زیادہ بہتر ہے، اگر کچھ اسلامی حکومتیں ہمت کر کے سود کے اس نظام سے نجات حاصل کر لیں تو بین الاقوامی طور پر بھی اس کا اثر ہوگا، بینک آف انگلینڈ قسم کے بین الاقوامی بینک ان ملکوں کو غیر سودی کاروبار کی سہولتیں مہیا کریں گے اور لوگوں کا یہ عذر کہ ہم سود کے بغیر بین الممالک تجارت کس طرح کر سکتے ہیں، ختم ہو جائے گا۔

(۳) دنیا حوادث کی آماجگاہ ہے، یہ مقولہ پہلے بھی صادق تھا اور اب تو ایسی حقیقت بن چکا ہے جس سے انکار ناممکن ہے، روزآنہ حوادث ہوتے رہتے ہیں، جن میں جانی اور مالی دونوں قسم کے نقصانات شامل ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ کل تک ایک بھلا چنگا آدمی جو ہاتھ پیروں سے صحیح سالم تھا آج اچانک کسی حادثہ کی زد میں آگیا اور اپاہج ہو کر رہ گیا، اس اپاہج کے ساتھ اس کا خاندان بھی مصائب وحوادث کا شکار ہے، نہ پیٹ بھرنے کو روٹی رہی

(۱) پاکستان میں ایک صاحب نے غیر سودی بینک پر ایک کتاب لکھی، اور تقریروں ولکچروں کے ذریعہ اس کی وضاحت کی، معلوم ہوا کہ اب وہ عملی طور پر بھی اس سلسلہ میں قدم اٹھا چکے ہیں اور ابتدائی سرمایہ جمع کرنے کے لئے کوشاں ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اس مقصد میں کامیابی عطا فرمائے، ''ماہنامہ المسلمون'' جو جنیوا سے زیر ادارت سعید رمضان صاحب شائع ہوتا ہے اس میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پیرس، کا غیر سودی بینک پر ایک مقالہ چھپا ہے، جس میں صاحب موصوف نے بتلایا ہے کہ، حیدرآباد میں ایک مرتبہ اس کا عملی تجربہ کیا جاچکا ہے۔

اور نہ ڈھانپنے کو کپڑا رہا، اسی طرح ایک بڑا صنعت کار جو کل تک ایک بڑی انڈسٹری کا مالک تھا اچانک کارخانہ میں آگ لگ گئی، مشینری اور سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا اور وہ اب نان جوین کا محتاج ہے، پھر ہر روز بسوں، موٹروں کے حادثے ہماری زندگی کا روزمرہ بن چکے ہیں، آخر ان نقصانات کی تلافی کس طرح ہو اور اس کا حل شریعت اسلامی میں کیا ہے؟

اس کا حل یہی ہے کہ امداد باہمی اور تعاون علی الخیر کے جذبہ کے ماتحت ایسے ادارے قائم کئے جائیں جو ارباب خیر اور مالداروں سے عطیات وصول کریں اور ان سے جمع شدہ رقوم کو تجارت اور انڈسٹری میں لگائیں ان اداروں کا کام یہ ہو کہ وہ تحقیق حال کے بعد نقصان زدہ افراد اور خاندانوں کی مالی امداد کریں، اس سلسلہ میں عام ادارے بھی بنائے جا سکتے ہیں اور خاص بھی، خاص کہ یہ صورت ہو کہ تاجر اپنا الگ ادارہ بنائیں صنعت کار اپنا الگ۔

اسلامی حکومت اگر اس سلسلہ میں جبر کرنا چاہے تو جبر بھی کر سکتی ہے کیونکہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی بعض صورتوں میں رعایا سے جبری عطیات وصول کرنے کا حق ہے۔

فان اريد بها ما يكون بحق كرى النهر المشترک واجر الحارس والموظف لتجهيز الجيش و فداء الاسارىٰ وغيرها جازت الكفالة بها على الاتفاق. (۱)

اگر اس سے وہ ٹیکس مراد ہیں جو جائز اور صحیح ہیں جیسے مشترک نہر کا کھودنا، پولیس کی تنخواہ یا فوج تیار کرنے کے لئے سب پر ذمہ داری ڈال دی جائے یا قیدیوں کو کافروں کی قید سے چھڑانے کے لئے عطیات تو اتفاقاً ان کی کفالت کی جا سکتی ہے۔

''ضرر عام'' ضرر خاص سے مقدم ہے، یہ بھی تو اسلامی قانون کا اصول ہے۔

تعاونی اداروں کے علاوہ دوسرا کام یہ ہوگا کہ معاقل کے اسلامی نظام کو پھر سے اسلامی معاشرہ میں جاری کیا جائے۔

(۱) ہدایہ باب الکفالۃ ۳/۱۰۹۔

معاقل:

معاقل مَعْقلۃ کی جمع ہے خون بہا کو کہتے ہیں، عقل کے معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں، اور دیت کے طریق کار سے لوگوں کی جانیں مفت میں چلی جانے سے محفوظ ہو جاتی ہیں، عاقلہ اس جماعت کو کہتے ہیں کہ جو قاتل کی طرف سے اجتماعی طور پر خون بہا ادا کرتی ہے۔

ہجرت کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ قائم کرایا تو ایک دستاویز بھی تحریر فرمائی جس میں دونوں کو ایک جماعت قرار دے کر حوادث اور نقصانات کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالی۔

محدث کبیر ابن ابی شیبہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

كتب رسول الله صلى الله عليه وسلم كتابا بين المهاجرين والانصار ان يعقلوا معاقلهم وان يفد وا عانيهم بالمعروف والاصلاح. (۱)

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار اور مہاجرین کے لئے ایک تحریر لکھوائی جس میں یہ کہا: کہ انصار اور مہاجرین ایک دوسرے کی دیت ادا کریں اور اگر کوئی قید ہو جائے تو اس کا فدیہ ادا کریں، قاعدہ قانون کے مطابق۔

قبائلی سسٹم میں قبیلہ عاقلہ سمجھا جاتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دواوین کو ترتیب دیا تو اہل الدیوان عاقلہ قرار پائے، پیشوں کی بنیاد پر بھی عاقلہ بنایا جا سکتا ہے۔

ولهذا قالوا لو كان اليوم قوم تناصرهم بالحرف فعاقلتهم اهل الحرفة. (۲)

اسی بناء پر مشائخ نے فرمایا کہ اگر آج کل تناصر پیشوں کی وجہ سے ہوتا ہو تو

(۱) نصب الرایۃ للزیلعی ج ۴/ .....، مجمع الزوائد ۴/۲۰۹۔

(۲) ہدایہ کتاب المعاقل ۴/۶۱۲۔

ایک پیشہ میں منسلک افراد عاقلہ قرار دیئے جائیں گے۔

عاقلہ پر ذمہ داریاں ڈالنے کی غرض و غایت اور اس کی حکمت امام سرخسی اس طرح بیان کرتے ہیں:

عاقلہ پر ذمہ داریاں ڈالنا عقلی طور پر یوں سمجھئے:

قاتل جب فعل قتل کا ارتکاب کرتا ہے تو اس میں خارجی قوت و طاقت کو بڑا دخل ہوتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ قتل کی پاداش میں جب میں پکڑا جاؤں گا تو میرے حمایتی میری مدد کو پہونچیں گے، اب حمایت و نصرت کے چند اسباب ہوتے ہیں، کہیں یہ اہل دیوان کی وجہ سے ہوتی ہے، کہیں قبیلوں اور خاندانوں کی بنیاد پر ہوتی ہے، کہیں محلے اور پیشوں کی بناء پر ہوتی، چونکہ قاتل ضرورت کے وقت ان ہی سے قوت و طاقت حاصل کرتا ہے، اس لئے خون بہا بھی ان ہی پر لگایا جائے گا۔ تاکہ یہ لوگ اپنے میں سے ناسمجھ اور بیوقوف لوگوں کو اس قسم کی حماقتوں سے روکیں، خون بہا کا مال بھی کافی مقدار میں ہوتا ہے، اس لئے سب پر ڈالنے سے وصولی میں آسانی ہوجاتی ہے، ہر ایک ادا بھی اس خیال سے کردیتا ہے کہ کل اگر مجھ سے بھی اس قسم کا فعل سرزد ہوگیا تو یہی لوگ ادا کریں گے۔(۱)

اسی طرح اگر کسی مقام پر کوئی لاش پائی جائے اور قاتل کا پتہ نہ چل سکے تو وہاں کی آبادی اجتماعی طور پر خون بہا ادا کرتی ہے۔

لہٰذا ان مسائل کی روشنی میں ایسا طریق کار اختیار کیا جاسکتا ہے کہ حادثات کی صورت میں ہر پیشہ کا عاقلہ خون بہا ادا کرے مثلاً بسوں کے مالک ایک عاقلہ قرار دیئے جائیں، کسی کی بس سے کوئی جانی یا مالی نقصان ہوجائے تو ان کی انجمن ادائیگی نقصان کی ذمہ دار ہو، اس سلسلہ کو دوسرے پیشوں اور حرفوں تک پھیلایا جاسکتا ہے، اور ان کے قواعد و ضوابط بنائے جاسکتے ہیں، عاقلہ پر ذمہ داری ڈالنا ان حوادث میں کمی کا باعث بھی بن سکتا ہے، جبکہ حوادث میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے، اور دن بدن ہو رہا ہے اب تو یہ عالم ہوگیا

(۱) المبسوط للسرخسی ۶/۶۶۔

ہے کہ لوگ خود اپنی موٹروں یا بسوں کو حادثہ کا شکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس طریقہ سے بیمہ کمپنی سے معقول رقم وصول کی جائے رہی قانونی گرفت تو اس سے بچنے کی راہیں نرم قوانین پر ان کی موشگافیوں نے بڑی حد تک ہموار کر رکھی ہے۔

(۳) چوتھا مقصد بیمہ کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ پسماندگان کی مالی امداد بڑی حد تک ہوجاتی ہے لوگ بیمہ اس لئے کراتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی اولاد پر کس مپرسی کے عالم میں مبتلا نہ ہو، اس مقصد کے سلسلہ میں عرض ہے کہ اگر کسی جگہ اسلامی نظام معیشت کی ترویج ہو تو کوئی باپ اپنے مرنے سے اس سے خوف زدہ نہیں رہ سکتا کہ میرے مرنے کے بعد میری اولاد مصیبتوں کی شکار ہوگی کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اسلام کے دستور مملکت میں یہ دفعہ بھی شامل ہے۔

حدثنا محمود قال اخبرنا اسرائیل عن ابی حصن عن ابی صالح عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انا اولیٰ بالمومنین من انفسهم فمن مات و ترک فما له لموالی العصبة ومن ترک کلا اوضیاعاً فأنا ولیه فادعیٰ له. (۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں مومنین سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہوں لہٰذا جو شخص مال چھوڑ کر مرے تو وہ مال اس کے عصبات کا ہے اور جو عاجز و درماندہ اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر مرے تو مجھے اس کے لئے بلایا جائے۔

نہ صرف شخص متوفی کے پسماندگان کی مالی امداد اسلامی حکومت کے ذمہ ہے بلکہ اس پر اگر کسی کا قرض ہو تو اس کو بار آخرت سے سبکدوش کرانا اور قرضخواہ کو اس کا حق دلوانا

(۱) بخاری ۲/۹۹۹۔

بھی حکومت کی ذمہ داری ہے، چنانچہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

فمن مات وعليه دين ولم يترک وفاء فعلينا قضاءه. (۱)

جس شخص نے انتقال کے بعد قرض چھوڑا اور اس کی ادائیگی کا کوئی سامان نہیں ہے تو میرے ذمہ اس کی ادائیگی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ عام ناداروں اور غریبوں کی کفالت بھی اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں میں داخل ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض وقت قرض لے کر ناداروں اور غریبوں کی دادرسی فرمائی، اور ان کو ننگا بھوکا رہنے نہیں دیا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ زمانہ رسالت میں اس ادارہ کے نگران تھے ابوداؤد اور بیہقی نے ان ہی کی زبانی روایت بیان کی ہے۔

وكنت انا الذی الی ذلک عنه منذ بعثه الله الی حين توفی وكان عليه السلام اذا اتاه الانسان مسلما يراه عاريا يامرنی فانطلق فاستقرض فاشتری له البردة فاكسوه واطعمه. (۲)

اور میں آپ کی بعثت سے لے کر وفات تک اس کا نگران تھا آپ کے پاس اگر کوئی مسلمان ننگا بھوکا آجاتا تھا تو آپ مجھے حکم دیتے تھے میں جا کر کسی سے قرض لیتا تھا، پھر اس سے اس کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرتا تھا۔

اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہدایت تھی۔

انفق بلال ولا تخش من ذی العرش اقلالا (۳)

بلال: خوب خرچ کر، اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے

(۱) صحیح بخاری ۶۷۳۱۔ (۲) ابوداؤد: ۳۰۵۵۔

(۳) الإشراف لابن المنذر بحوالہ الترتیب الإداریۃ ۱/۴۴۲۔

تنگدستی سے نہ ڈر۔

غلاموں کے خرچ میں اگر کسی سے کوئی کوتاہی ہوجاتی تھی تو ان کا خرچ بھی اس ادارہ کے ذمہ تھا، مروان بن قیس درسی کے حالات میں درج ہے کہ ان کے پاس دو غلام تھے وہ ان کے خرچ میں ہمیشہ بخل سے کام لیتے تھے ان دونوں نے بارگاہ رسالت میں شکایت کی، شکایت سنتے ہی حضرت بلال کو حکم دیا گیا۔

فامر بلالا ان يقوم بنفقتهما. (۱)

بلال کو حکم دیا کہ ان دونوں کے نفقہ کا انتظام کریں۔

ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک شخص کے پاس مال وغیرہ سب کچھ ہے، بچے چھوٹے ہیں ڈرتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد مال کو صحیح طریقہ پر خرچ نہیں کیا جائے گا، مال کی نگرانی اور اس کی حفاظت میں دشواریاں ہوں گی اس لئے اپنے مال کو بیمہ کمپنی کے سپرد کردیتا ہے، تاکہ مال نقصان سے محفوظ رہے، اور بچوں کی ضرورت (تعلیم وشادی) کے موقعہ پر ملتا رہے۔

اس صورت کا حل ''وصایۃ'' کے نظم میں ہے یعنی اس شخص کو چاہئے کہ کسی کو اپنا وصی مقرر کرجائے، ''وصی'' کے باضابطہ فرائض ہیں جس کو فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اجمالی فرائض کا نقشہ ہدایہ میں اس طرح دیا گیا ہے۔

شراء كفن الميت وتجهيزه وطعام الصغار وكسوتهم ورد الوديعة ورد المغصوب والمشتری شراء فاسداً وحفظ الاموال وقضاء الديون وتنفيذ وصية والخصومة فی حق الميت وقبول الهبة وبيع ما يخشی عليه التویٰ والتلف وجمع الاموال الضائعة. (۲)

(۱) التراتیب الإداریۃ ۳۴۳۔

(۲) ہدایہ ۴/۶۷۹۔

میت کے کفن کی خریداری اور اس کی تجہیز وتکفین، چھوٹے نابالغ
بچوں کے خورد ونوش اور کپڑوں کا انتظام امانت اور غصب کئے
ہوئے اموال کی واپسی، مال و جائیداد کی حفاظت قرضوں کی
ادائیگی، وصیت کے نفاذ کے انتظامات مرنے والے کے کسی حق
کے لئے مقدمہ کرنا، ہبہ قبول کرنا، جن چیزوں کے خراب ہونے کا
ڈر ہو ان کو فروخت کرنا گمشدہ اموال کے واپسی کی کوشش کرنا۔

''وصایۃ'' کے نظم پر عہد رسالت اور دور صحابہ میں برابر عمل ہوتا رہا، چنانچہ جعفر بن ابی طالب کی شہادت کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر کے دونوں صاحبزادوں محمد اور عبداللہ رضی اللہ عنہما کے وصایت کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے فرمایا:

انا ولیهم فی الدنیا والآخرة. (۱)

دنیا اور آخرت میں میں ان کا سرپرست ہوں۔

اور صاحب ''سمط الجوہر الفاخر'' نے ایسے متعدد یتیم بچوں کے نام گنائے ہیں جن کے آپ وصی تھے جن میں سے تین کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) محمد بن عبداللہ بن جحش ان کے والد ماجد غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے، شہادت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وصی مقرر فرمایا، آپ نے ان کے لئے خیبر میں زمیں خریدی جس سے ان کا خرچ پورا ہوتا تھا اور مدینہ منورہ کے سوق الرقیق میں ایک گھر بطور عطیہ کے دیا جن میں ان کی رہائش تھی۔

(۲) ام زینب بنت نبیط: ان کے والد سعد بن زرارہ نے آپ کو وصی مقرر کیا تھا

(۳) قبیلہ بنی لیث بن بکر کی ایک بچی اس کے بھی آپ وصی تھے۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بار وصایت کے اٹھانے میں بڑے مشہور تھے چنانچہ ان کو سات جلیل القدر صحابہ حضرت عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، مقداد بن الاسود، ابن

(۱) أخرجہ احمد: ۱۷۵۰۔

مسعود، زبیر بن بکار، مطیع بن الاسود، ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہم نے وصی مقرر کیا تھا (۱)۔ ابوعبداللہ السلویؒ نے سات کے بجائے ستر کا ذکر کیا ہے، چنانچہ کہا ہے:

واوصی الیه سبعون من الصحابة باموالهم واولادهم فحفظها وکان ینفق علیهم من ماله. (۱)

ستر صحابہ نے ان کو اپنے اموال واولاد کا نگران مقرر کیا حضرت زبیر ان پر اپنا مال بھی خرچ کر دیا کرتے تھے۔

اگر کسی نے اپنا وصی مقرر نہیں کیا ہو تو اموال کی حفاظت اور اولاد کی صیانت کے لئے حاکم کو حق دیا گیا ہے کہ وہ وصی مقرر کرے ورنہ ''بیت المال'' میں ان کے اموال جمع کرلے اور ضرورت کے موقع پر خرچ کرے۔

جواب کا حصہ دوم

سوال نامے کے فاضل مرتب نے جو سوالات قائم کئے ہیں یہاں ہم ان کو مع جوابات ترتیب سے درج کرتے ہیں:

(۱) انشورنس کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے اس میں کمپنی جو رقم بطور سود دیتی ہے جس کا نام وہ اپنی اصطلاح میں منافع رکھتی ہے، شریعت کا اصطلاحی ربوا ہے یا نہیں۔

بیمہ کی حقیقت جن حضرات کے پیش نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ بیمہ میں دو طرح سے شریعت کا اصطلاحی ربوا پایا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ بیمہ کمپنی بیمہ داروں سے جو رقم وصول کرتی ہے وہ ضرورت مندوں کو سود پر قرض دیتی ہے، دوسرے بیمہ داروں کو ان کی کل اقساط کی ادائیگی جو رقم زائد بطور منافع دیتی ہے وہ سود ہوتی ہے کیونکہ بیمہ دار جو رقم بصورت اقساط جمع کرتا ہے وہ ''دین'' ہے (۲) اور دین میں اجل (میعاد) کے مقابلہ میں

(۱) أسد الغابۃ والإصابۃ تذکرہ حضرت زبیرؓ۔

(۲) شرح ھمزیہ بحوالہ التراتیب الإداریۃ۔ ''دین'' کی اصلاح پچھلے صفحات میں سمجھائی جا چکی ہے۔

جومنافع بطور مشروط (۱) یا معروف دیا جائے وہ شرعی اور اصطلاحی ربوا ہے جس کی حرمت قرآن کریم، حدیث نبوی اور اجماع امت سے ثابت ہے، علاوہ ازیں سوالنامہ کے مرتب کو اعتراف ہے۔

حقیقت کے لحاظ سے انشورنس کا معاملہ ایک سودی کاروبار ہے جو بینک کے کاروبار کے مثل ہے، دونوں میں جوفرق ہے وہ شکل کا ہے حقیقت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جن نام نہاد علماء نے انشورنس کے کاروبار کو بالکل جائز قرار دیا ہے ان کے پاس لے دے کے صرف یہ دعویٰ رہ جاتا ہے کہ قرض میں جو منافع دیا جاتا ہے وہ شرعی اصطلاحی ربوا نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے اور شریعت محمدیہ پر بہت بڑا بہتان ہے، ہم اس دعویٰ کی تردید پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں اور بتلا چکے ہیں کہ قرآن کریم کی آیت ربوا قرض وتجارت کے جاہلی نظام کو ختم کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی جاہلی نظام میں قرض اور تجارت کے ذریعہ سود لیا جاتا تھا اور یہ ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس سے انکار ناممکن ہے، ہمارے سارے اسلامی لٹریچر کا ایک ایک حرف اس کی دلیل ہے، پچھلے صفحات میں ہم امام ابوبکر الجصاص الرازی کی زبانی آیت ربوا کا پس منظر بتلا چکے ہیں، یہاں اس پر مزید اضافہ حاضر خدمت ہے، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:

وروی مالک عن زید بن اسلم فی تفسیر الآیة قال کان الربوا فی الجاهلیة ان یکون للرجل علی الرجل حق الی اجل فاذا حل قال اتقضی ام تربی فان قضاه

(۱) مشروط کا مطلب تو یہ ہے کہ معاملہ کے وقت زبانی یا تحریری شرط لگائی جائے، مثلاً کہہ دیا جائے ہم سوا سیکڑہ منافع لیں گے، معروف کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ کے وقت زبانی یا تحریری شرط نہیں لگائی، لیکن دستور ہے کہ سوا روپیہ سیکڑہ نفع دیا جاتا ہے تو یہ بھی مشروط کے حکم میں ہے، اس لئے شریعت کا قاعدہ ہے، المعروف کالمشروط یعنی معروف بھی مشروط کی طرح ہے۔ یہ قاعدہ الأشباہ والنظائر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اخذ وإلاّ زاد فی حقه وزاد الآخر فی الاجل (۱)

امام مالک زید بن اسلم سے آیت ربوا کی تفسیر اس طرح روایت کرتے ہیں، جاہلیت کا ربوا اس طرح ہوتا تھا کہ ایک کا دوسرے پر کوئی حق ہوتا تھا (حق عام ہے، قرض ہو خریدی ہوئی چیز کی قیمت ہو کچھ اور) اور اس کی ادائیگی کی ایک میعاد مقرر ہوتی تھی، جب میعاد آجاتی تھی تو وہ کہتا تھا کہ ادا کروگے یا سود دوگے؟ وہ اگر ادا کر دیتا تو رقم میں اضافہ نہیں ہوتا تھا، ورنہ اس کے حق میں اضافہ کر دیتا تھا اور دوسرا اس کے بجائے آگے میعاد بڑھا دیا کرتا تھا۔

اور ابن رشد الکبیر ''المقدمات'' میں لکھتے ہیں:

وکان ربا الجاهلیة فی الدیون ان یکون للرجل علی الرجل الدین فاذا حل قال له أتقضیٰ ام تربی فان قضاه اخذ وإلا زاده فی الحق وزاده فی الاجل فانزل الله فی ذلک ما انزل .

جاہلیت کا ربوا (سود) دیون (۲) میں ہوتا تھا ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ کچھ واجب الاداء ہوتا تھا جب ادائیگی کی میعاد آجاتی تھی وہ اس سے معلوم کرتا تھا کہ ادائیگی کا ارادہ ہے یا سود دینے کا اگر وہ ادا کر دیا کرتا تھا وہ لے لیا کرتا تھا، ورنہ مدیون رقم میں اضافہ کر دیا کرتا تھا اور دوسرا میعاد میں۔

اس ربوا کو حلال سمجھنے والے کے بارے میں ابن رشد الکبیر فتویٰ دیتے ہیں

فمن استحل الربا فهو کافر حلال الدم یستتاب فان

(۱) فتح الباری ۴/۲۶۴۔

(۲) دین کی جمع، دین کی تشریح جو ہم سابق میں کر چکے ہیں، پیش نظر رکھیں۔

تاب و إلا قتل قال الله عز و جل ومن عاد فاولئك اصحاب النار هم فيها خالدون.(۱)

جو شخص ربوا کو حلال سمجھے وہ کافر ہے، جس کو قتل کرنا حلال ہے، پہلے اس سے توبہ کرائی جائے گی، توبہ کرلے تو بہتر ہے ورنہ قتل کردیا جائے گا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: کہ جو لوگ ممانعت کے باوجود پھر سود لیتے ہیں وہ دوزخی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ائمہ مجتہدین نے بھی اس سے یہی سمجھا ہے، امام محمد بن ادریس القرشی المطلبی الشافعی فرماتے ہیں:

وذلك ان الربا منه يكون فى النقد بالزيادة فى الكيل والوزن ويكون فى الدين بزيادة الاجل.(۲)

ربوا نقد میں ہوتا ہے اور ادھار میں بھی نقد میں تو یہ ہے کہ ناپ تول میں اضافہ کردیا جائے ادھار میں یہ ہے کہ میعاد کی وجہ سے دین میں اضافہ کردیا جائے۔

پھر یہ مسئلہ اجماعی اور اتفاقی ہے لہٰذا کسی کو اس سے سرمو انحراف کی گنجائش ہی نہیں ہے، قاضی ابوالولید ابن رشد رقم فرما ہیں:

علماء کا اتفاق ہے کہ ربوا دو چیزوں میں پایا جاتا ہے (۱) تجارت کی بعض صورتوں میں (۲) اس چیز میں جو ذمہ میں آجائے مثلاً خریدی ہوئی چیز کی قیمت یا قرض یا سلم وغیرہ، ذمہ میں جو چیز آجائے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم تو متفق علیہ ہے اور وہ زمانہ جاہلیت کا ربوا ہے، جس کی ممانعت کی گئی ہے اور اس کی صورت یہ تھی کہ وہ میعاد کے اضافے کے بدلے اصل واجب الاداء رقم میں اضافہ کرلیا کرتے تھے وہ کہتے تھے انظرنی ازدک (مہلت

(۱) حاشیہ المدونۃ الکبریٰ ۳/۱۹۔

(۲) الأم ۳/۱۲-۱۳۔

بڑھادو میں اس کے بجائے بڑھتی دے دوں گا، یہ وہی سود ہے جس کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جاہلیت کا ربوا ختم کردیا گیا ہے اور سب سے پہلے عباس بن عبدالمطلب کے ربوا کو ختم کرتا ہوں۔(۱)

شیخ ابوبکر ابن العربی نے احکام القرآن میں آیت ربوا پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، اس کے ایک حصہ کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے:

الربا: لغت میں زیادتی کو کہتے ہیں، زیادتی میں مزید علیہ یعنی وہ چیز جس پر زیادتی کی جائے ہونا ضروری ہے، اس بناء پر اختلاف ہوا کہ یہ آیت ہر ربوا کے حرام ہونے میں عام ہے یا یہ مجمل ہے جس کو حدیث کے بیان وتشریح کی ضرورت ہے، صحیح یہی ہے کہ آیت عام ہے، بزمانہ جاہلیت جو ربوا تھا وہ بالکل مشہور ومعروف طریقہ پر ان کے یہاں رائج تھا، ایک شخص کسی سے کوئی چیز خرید کر قیمت اسی وقت ادا نہیں کرتا تھا بلکہ ادائیگی کی ایک میعاد مقرر کرلی جاتی تھی، جب میعاد پوری ہوتی تو فروخت کرنے والا، خریدنے والے سے پوچھ لیتا تھا، تیرا ارادہ ادائیگی کا ہے یا سود دینے کا ہے، جیسا وہ جواب دیتا اس کے مطابق عمل ہوتا، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو حرام فرمایا۔

یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ زیادتی مزید علیہ (جس پر زیادتی کی جائے) کے بغیر ممکن نہیں ہے، لہٰذا جب کسی چیز کو غیر جنس کے مقابلہ میں فروخت کیا جائے تو زیادتی (بڑھتی) ظاہر نہیں ہوتی اور جب جنس کے مقابلہ میں فروخت کیا جائے تب بھی زیادتی اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک کہ شریعت اس کو ظاہر نہ کردے (۲) اسی لئے یہ آیت بعض لوگوں کو مشکل معلوم ہوئی اور وہ مختلف قسم کے اشکالات میں مبتلا ہوگئے، لیکن جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے شریعت کے علوم کی روشنی عطا فرمائی ہے وہ آیت کریمہ کو سمجھنے میں کسی قسم کی

(۱) مثلاً روپئے کے عوض کوئی جنس گیہوں وکپڑا وغیرہ خریدا جائے۔ حدیث ۱۲۱۸ رواہ مسلم، ابوداد ۱۹۰۵، ابن ماجہ ۳۰۷۴۔

(۲) چنانچہ شریعت نے ہدایت کی کہ اس صورت میں زیادتی نہ کی جائے بلکہ برابری کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔

دقت محسوس نہیں کرتے .....جن لوگوں کا خیال ہے کہ آیت مجمل ہے وہ لوگ درحقیقت شریعت کے محامل قطعیہ کو نہیں سمجھتے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی قوم کی طرف مبعوث فرمایا جن کی زبان عربی تھی، تجارت، بیع، ربوا وغیرہ الفاظ ان کے یہاں عام طور پر سمجھے جاتے تھے لہٰذا ان کو ان معاملات میں صحیح اور سچی بات کی ہدایت کی اور ان چیزوں سے منع کیا جو ناجائز اور غلط تھیں چنانچہ ارشاد فرمایا ﴿ **ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارة عن تراض منکم** ﴾ (۱) (اے ایمان والو نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے) واضح رہے کہ یہاں باطل سے مراد یہ ہے کہ کسی کے مال کو عقد معاوضہ میں بغیر عوض کے لے لینا۔

اور تجارت بیع (خرید وفروخت) کے ہم معنی ہے (پھر اس کی قسمیں بتلائی ہیں) اور الربا لغت میں زیادتی (بڑھتی) کو کہتے ہیں اور آیت میں ربوا سے مراد ہر وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں عوض نہ ہو، دونوں آیتوں (۲) کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیع مطلق کو حلال کیا ہے جس میں بشرط صحت قصد وعمل معاوضہ پایا جائے اور جس میں معاوضہ اس طریقہ پر نہ پایا جائے وہ حرام ہے۔

اہل جاہلیت میعاد اور وقت کے مقابلہ میں بڑھتی کے خواہاں ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ بیع تو ربوا کی طرح ہے یعنی جس طرح ایک شخص قیمت میں زیادتی لے سکتا ہے تو اس میں کیا حرج ہے کہ میعاد پر نہ دینے کی صورت میں زیادتی لے لے ان کے اس خیال باطل کو رد فرمایا.....

اب یہ قرار پایا کہ:

اموال ربوا میں معاوضہ کی مقدار شریعت نے اپنے ذمہ لے لی، اب کوئی شخص ان میں زیادتی کسی طرح کی میعاد وغیرہ کے مقابلہ میں نہیں لے سکتا۔ (۳)

(۱) باطل تو ہر حال میں حرام ہے خواہ رضامندی ہو یا نہ، تجارت میں رضامندی کی قید لگائی ہے، شریعت نے جن معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لیا ہے اس میں طرفین کی رضامندی غیر ضروری ہوگی۔ (ماخوذ آیت: النساء پارہ ۵ رکوع ۴۔ (۲) یعنی آیت ربوا و آیت تجارت۔
(۳) احکام القرآن لابن العربی ۱/۲۴۳۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے ربوا کی بڑی جامع ومانع تعریف بیان فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

الربا وھو القرض علی ان یودی الیه اکثر او افضل مما اخذ. (۱)

ربوا وہ قرض ہے جو اس شرط پر ہو کہ قرضدار قرضخواہ کو جتنا لیا ہے اس سے زیادہ یا اس سے اچھا واپس کردے۔

ربوا شرعی پر علامہ محمود حسن خانصاحب ٹونکیؒ صاحب معجم المصنفین نے بڑی دقیق بحث فرمائی ہے، ہم یہاں اس کا ایک حصہ نقل کرتے ہیں:

ربوا اور بیع لغات عرب سے ہے، جب تک کوئی اصطلاح شرعی توقیفی خلاف لغت کے مغیر نہ ہو کتاب وسنت کے معنی لغت عرب سے معلوم ہوتے ہیں، ربوالغۃً زیادتی ہے اور لسان العرب وغیرہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ حقیقت بیع کی معاہدہ فی تعارض الاموال ہے پس لغوی اعتبار سے ربوا کی تعریف یہ ہے کہ تعارض الاموال کے معاہدہ میں عوضین مماثلین میں سے ایک عوض کا دوسرے عوض پر زیادتی مذکور ہونا (مذکور نہ ہو بلکہ معروف ہو اس کا بھی یہی حکم ہے) باجماع امت ربوا کی دو قسم ہیں ایک حسی جس کو کتاب اللہ نے ﴿ **لا تاکلوا الربا اضعافاً مضاعفة** ﴾ (۲) میں بیان فرمایا ہے اور حدیث صحیح الفضل ربا میں اس حسی ربوا کو بیان کیا گیا ہے اور حدیث **فلا یاخذن إلا مثلاً بمثل** (۳) (بروایۃ فضالہ ابن عبید) اور حدیث **لا تاخُذُ والدِّیْنَارَ بالدِّیْنَارین ولا الدرھم بالدرھمین** (۴) (طبرانی عن ابن عمر) یہی بحق ربا کتاب اللہ کی تفسیر ہے، اور تفسیر اضعافاً کے تحت داخل ہے، حدیث بخاری کی رباحسی کی مفسر ہے، الذھب بالذھب مثلاً بمثل (رواہ البخاری) یعنی فضل ربوا ہے، پس اس حسی ربوا میں شارع نے لغوی معنی میں اور شرعی معنی میں مغایرت پیدا نہیں فرمائی ہے پس حسی

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۰۶۔ (۲) سورہ آل عمران: ۱۳۱۔
(۳) مسلم: ۱۵۹۱۔ (۴) طبرانی عن ابن عمرؓ ۹۸۳۰ 'لاتبیعوا' کے الفاظ کے ساتھ یہ حدیث مسلم وغیرہ میں موجود ہے۔

ربا شرعی کی بھی وہی تعریف ہے جس کی عربی عبارت یہ ہے ''**هو الفضل الخالی عن العوض المشروط فی البیع**'' دوسرا ربا حکمی ہے کہ ''**حسا تفاضل عوضین**'' میں نہیں ہے لیکن شارع نے سدالباب الربا صورت تماثل کو بھی ربوا حسی کے حکم میں قرار دیا ہے جب کہ معاوضہ یداً بید نہ ہو کیونکہ مادہ ربا کا تاخیر وتاجیل ہے اور بغیر تاخیر کے فضل غیر متعامل ہے، اس معنی پر محمول ہے حدیث مسلم (۱) ''**لا ربا فیما کان یداً بید**'' فضل حسی کا دروازہ اسی ربا حکمی سے مفتوح ہے کہ تجارت حاضرہ میں نقل حسی عادۃً ناممکن ہے۔

اس ربا حکمی کو شارع نے حدیث نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع دینار اور حدیث ''**الذهب بالورق رباء إلاهاء وهاء الحديث فی الاشياء الستة**'' میں بیان فرمایا ہے۔ (۲)

اقتباسات طویل ہو گئے اس لئے ان کا خلاصہ ذہن نشین کر لیئے:

ربوا شرعی اصطلاحی قرض اور تجارت دونوں میں پایا جاتا ہے۔

ربوا شرعی کو تجارت کی صرف چند شکلوں کے ساتھ خاص کرنا اسلام پر افتراء ہے۔

اسلام کی نظر میں مہاجنی سود اور تجارتی سود دونوں حرام ہیں، صرف مہاجنی سود کو حرام قرار دینا اور تجارتی سود کو جائز قرار دینا شریعت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

ہر وہ چیز جو ذمہ پر آجائے اس میں زیادتی مشروط یا معروف طریقہ پر لینا سود ہے خواہ وہ بیع کی صورت میں ہو یا قرض سلم کی شکل میں ہو۔

اموال ربویہ میں تساوی (برابری ضروری ہے، زیادتی کی صورت میں شرعی ربوا پایا جائے گا۔

انشورنس اور بینکنگ میں شرعی ربوا پایا جاتا ہے۔

زیادتی کی شرط کا لفظوں میں بیان کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ جو شرط معروف ہو وہ

(۱) مسلم شریف مراد ہے: ۱۳۳۹۔

(۲) رسالہ سود بحوالہ لغات القرآن ج ۳ لفظ ربوا، صحیح مسلم: ۱۵۸۶۔

بھی مشروط کے حکم میں ہے۔

شریعت میں حقیقت کا اعتبار ہوتا ہے، تسمیہ (نام رکھ دینے) کا نہیں

شریعت نے جن عقود و معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اس میں حرام وحلال کا فیصلہ فرما دیا ہے ان میں طرفین کی رضامندی سے کچھ فرق نہیں پڑتا، شریعت کے حکم کو پیش نظر رکھا جائے گا، طرفین کی رضامندی اس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔

۲۔ اگر سود مذکور شرعی اصطلاحی ربوا ہے تو کیا مصالح مذکورہ کے پیش نظر اس کے جواز کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے، اگر نکل سکتی ہے تو کیا؟

مصالح مذکور کی بناء پر انشورنس (جو ربوا اور قمار دونوں پر مشتمل ہے) کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے، امام ابواسحاق الشاطبی نے ''الاعتصام'' میں اس موضوع پر ایک مستقل باب لکھا ہے اس میں مفصل دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ مصالح مرسلہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شریعت نے ہمیں چھٹی دے دی ہے، بے مہار چھوڑ دیا ہے کہ مصالح کو سامنے رکھ کر جس طرح چاہیں قوانین اسلامی میں ترمیم کرتے رہیں، بلکہ اس کے لئے تین اہم شرطیں ہیں:

اول۔ مصالح کے پیش نظر جو قانون بنایا جائے وہ شریعت کے مقاصد کے مطابق ہو نہ کہ ان کے خلاف۔

دوم۔ جب وہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو عام عقلیں اس کو قبول کریں۔

سوم۔ وہ کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہو۔ (۱)

اس کے علاوہ امام موصوف نے ''الموافقات'' میں مفاسد اور مصالح پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ''مصالح'' وہی معتبر ہیں جو شریعت کی نگاہ میں مصالح ہوں

(۱) شریعت کا مشہور قاعدہ ہے ''انما العبرة فی العقود للمعانی لا للالفاظ'' ملاحظہ ہو الأشباہ والنظائر، یعنی کسی معاملہ کی حقیقت کا اعتبار ہوگا اور اس کے لحاظ سے شرعی احکام جاری ہوں گے، نام رکھنے سے کچھ نہیں ہوگا، ربوا کا نام اگر منافع رکھ لیا جائے تو اس سے وہ حلال نہیں ہوگا، بنی اسرائیل پر جب چربی حرام ہو گئی تھی تو انہوں نے اس کا نام دوسرا رکھ لیا تھا اور کھانا شروع کر دیا تھا۔

اور شریعت جن کا اعتبار کرے، صرف چند ظاہری فائدوں کو مصالح نہیں کہا جائے گا، مثلاً شریعت نے ''نکاح فاسد'' کو قابل قبول نہیں سمجھا حالانکہ اس میں بعض مصالح نظر آتے ہیں، جیسے نسب کا ثابت ہونا، میراث کا دیا جانا وغیرہ۔

بحث کے آخر میں فرمایا:

وہی مصالح قابل اعتبار ہیں جو اسباب مشروعہ سے حاصل ہوں، اسباب غیر مشروعہ سے حاصل ہونے والے مصالح شریعت کی نگاہ میں مصالح نہیں ہیں۔(۱)

علاوہ ازیں یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ایسے احکام جو قرآن وحدیث میں منصوص ہوں وہاں مصالح ومفاسد کی بحث ہی پیدا نہیں ہوئی، ربوا اور قمار دونوں کی حرمت قرآن کریم سے ثابت ہے اس لئے کوئی مصلحت اس حرام کو حلال نہیں کرسکتی۔

۳۔ زندگی کے بیمہ، املاک، ذمہ داری کے بیمہ کے درمیان شرعاً کوئی فرق ہوگا یا تینوں کا حکم ایک ہی ہوگا۔

تینوں قسمیں ربوا اور قمار پر مشتمل ہیں اس لئے تینوں کا حکم ایک ہی ہے۔

۴۔ معاملہ کی یہ شرط کہ اگر بیمہ شدہ شخص یا شئے وقت معین سے پہلے تلف ہوجائے تو اتنی رقم ملے گی اور اس کے بعد تلف ہوتی ہے تو اتنی، جب کہ تلف ہونے کے وقت کا تعین غیر ممکن ہے اس معاملہ کو قمار کے حدود میں تو داخل نہیں کردیتی ہے؟

بلاشبہ قمار ہے، قمار کے بارے میں علمائے شریعت نے جو قاعدہ لکھا ہے وہ یہ ہے

تعلیق الملک علی الخطر والمال فی الجانبین (۲) اور بیمہ پر یہ قاعدہ بالکل صادق ہے اس لئے اس پر بنص قرآن ثابت ہے، قمار کی حرمت میں غرر اور خطر (۳)

(۱) الاعتصام ص۱۱۰ ج۲۔

(۲) یعنی ملک کو کسی ایسی چیز پر موقوف کرنا جو ہونے یا نہ ہونے کا احتمال رکھے جس طرح بیمہ میں ہوتا ہے کہ اگر پہلے مرگیا تو اس قدر رقم کا مالک ہوگا ورنہ اتنی رقم نہیں ملے گی، قمار (جوا) ہونیکی دوسری شرط یہ بھی ہے کہ دونوں طرف مال ہو اگر ایک طرف مال ہو تو قمار نہیں ہے۔ (الوسیط، السنہوری ۹۸۸، ۲۱۷۔)

(۳) غرر کی تشریح پہلے گذر چکی ''خطر'' جس کا وجود وعدم معلوم نہ ہو، بیمہ میں ''خطر'' واضح صورت میں پایا جاتا ہے کہ بیمہ شدہ شخص یا شئے کا وقت معین سے پہلے تلف ہونا معلوم نہیں ہوتا، اور نہ کوئی وقت معین ہوتا ہے۔

کی ساری صورتیں داخل ہیں، ابوبکر الجصاص الرازی آیت میسر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

ولا خلاف بین اهل العلم فی تحریم القمار وان المخاطرة من القمار ، قال ابن عباس ان المخاطرة قمار وان اهل الجاهلية كانوا يخاطرون على المال والزوجة وقد كان ذلک مباحاً الى ان ورد تحريمه. (۱)

قمار (جوا) کی حرمت میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے، اسی طرح اس امر میں بھی کہ خطر کی ساری صورتیں قمار میں داخل ہیں

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ''خطر'' قمار ہے اہل جاہلیت مال اور بیوی سب کو جوئے کی بازی پر لگا دیا کرتے تھے اور شروع میں اس کی اباحت تھی یہاں تک کہ اس کی حرمت نازل ہوئی۔

غرر اور خطر میں انجام سے بے خبری ہوتی ہے، ملک العلماء فرماتے ہیں:

والغرر ما يكون مستور العاقبة(۲) غرر وہ ہے جس میں انجام سے بے خبری ہو۔

حاصل یہ ہوا کہ مال کو بازی پر لگانا اور انجام سے بے خبر ہونا جوا ہے، اسی طرح وہ معاملہ جس میں دونوں طرف مال ہو اور انجام معلوم نہ ہو قمار کی حدود میں داخل ہے، خواہ وہ خرید وفروخت کی شکل میں ہو یا بیمہ کی شکل میں

امام دار الہجرۃ مالک بن انسؒ اس قسم کے ایک معاملہ کی مثال دیتے ہیں:

ان يعمد الرجل الى الرجل قد ضلت راحلته او دابته او غلامه وثمن هذه الاشياء خمسون ديناراً فيقول انا آخذها منک بعشرين ديناراً فان وجدها المبتاع ذهب من مال البائع بثلاثين ديناراً وهمالا يدريان كيف يكون

(۱) الاحکام ۱/۳۸۸۔ (۲) البدائع والصنائع ۳/۶۸۔

حالهما فی ذلک ولا یدریان ایضاً اذا وجدت تلک الضالة کیف توخذ وما حدث فیها من امر الله مما یکون فیه نقصها وزیادتها فهذا اعظم المخاطرة. (۱)

ایک شخص دوسرے شخص کے پاس جائے جس کا اونٹ یا کوئی جانور یا غلام گم ہوگیا ہو اور ان کی قیمت مثلاً پچاس دینار ہو، وہ جا کر اس سے کہے میں تم سے اس گمشدہ چیز کو بیس دینار میں خریدتا ہوں سو اگر خریدنے والے کو گمشدہ چیز مل جاتی ہے تو مالک کو تیس دینار کا نقصان ہوگا اور اگر نہیں ملتی تو اس کو بیس دینار مفت میں مل جائیں گے، ان دونوں کو معاملہ کرتے وقت کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوگا وہ چیز ملتی ہے یا نہیں اور اگر ملتی بھی ہے تو کس حال میں؟ اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس میں کیا زیادتی کمی ہو چکی ہے، یہ سب ''خطر'' میں داخل ہے۔

۵۔ اگر یہ قمار یا غرر ہے تو کیا مصالح مذکورہ کے پیش نظر اسے نظر انداز کر کے اس معاملہ کے جواز کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے اور اگر نکل سکتی ہے تو کیسے؟

جب تک بیمہ کا موجودہ نظام برقرار ہے، کوئی صورت نہیں نکل سکتی۔

۶۔ اگر بیمہ دار مندرجہ اقسام بیمہ سے کسی میں سود لینے سے بالکل محترز رہے اور اپنی اصل رقم کی صرف واپسی چاہتا ہو تو کیا معاملہ جائز ہوسکتا ہے۔

سود کے ساتھ ہی ساتھ بیمہ زندگی یا بیمہ املاک میں قمار کی جو صورت ہوتی ہے اس سے بھی احتراز کرے تب تو گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن ربوا اور قمار کے کاروبار کی اعانت و امداد کی قباحت بدستور رہے گی۔

۷۔ جو رقم کمپنی بطور سود ادا کرتی ہے اس سے ربوا کے بجائے اس کی جانب سے

(۱) المدونۃ الکبری ۳/۳۵۴۔

اعانت وامداد اور تبرع واحسان قرار دیا جاسکتا ہے۔

جب تک معاملہ کی حقیقت تبدیل نہ ہو صرف نام رکھ لینے یا سمجھ لینے سے مسئلہ شرعی میں فرق نہیں پڑتا۔

۸۔ اگر کوئی مسلمان کسی دار الحرب کا باشندہ ہو (مستامن نہیں) اور کمپنی بھی حربیوں ہی کی ہو تو کیا اس صورت میں یہ معاملہ مسلمانوں کے لئے جائز ہوگا؟

دار الحرب میں فقہاء نے عقود فاسدہ(۱) کی اجازت دی ہے، عام کتابوں میں اگرچہ مستامن کی قید ہے لیکن شرح السیر الکبیر سے حربی مسلم کے لئے بھی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

ثم قد علم ان الربا لا یجری بین المسلم والحربی فی دار الحرب. (۲)

پھر یہ امر معلوم ہے کہ ربوا (سود) دار الاسلام کے باشندہ اور دار الحرب کے باشندہ کے درمیان جاری نہیں ہوتا۔

اس کی دلیل بھی خود مولف کی زبان سے سنئے

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کب اسلام لائے، بعض کی رائے یہ ہے کہ وہ غزوہ بدر سے پہلے اسلام لا چکے تھے، بعض کہتے ہس کہ غزوہ بدر میں گرفتار کر لئے گئے اور اس کے بعد اسلام لائے، پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ''مکہ'' واپس جانے کی اجازت چاہی، آپ نے اجازت مرحمت فرمادی، مکہ میں سکونت پذیر رہے، اور وہاں سودی کاروبار فتح مکہ تک کرتے رہے حالانکہ سود کی حرمت اس سے قبل آچکی تھی، چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو صحابہ سے غزوہ خیبر میں فرمایا کہ تم نے اگر سود لیا ہو تو واپس کر دو علاوہ ازیں لا تاکلوا الربا اضعافاً مضاعفة (سود

(۱) وہ معاملات جو شریعت کی نگاہ میں صحیح نہیں ہیں، البتہ ان میں رضامندی کی شرط ضروری ہے، غدر کی اجازت نہیں ہے۔ (۲) ص ۳/۱۱۲۔

نہ کھاؤ، دو چند سہ چند) آیت کریمہ غزوہ احد کے زمانہ میں اتری تھی اور فتح مکہ اس کے کئی سال بعد ہوا، فتح مکہ کے زمانہ میں آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پچھلے سارے معاملات کو باطل قرار نہیں دیا، سوائے ان معاملات کے کہ جن میں ابھی تک قبضہ نہیں ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ حربی اور مسلم کے درمیان سودی معاملہ ہوسکتا ہے۔(۱)

ایک اور جزئیہ قابل ملاحظہ ہو

ولو كان المسلم فى منعة المسلمين فكلمه الحربى من حصنه و عامله بهذه المعاملات الفاسدة فيما بين المسلمين فان ذلك لا يجوز ، وقد بينا ان كثيرا من مشائخنا يقولون بالجواز هاهنا لان مال الحربى مباح فى حق المسلم.(۲)

اگر کوئی مسلمان، اہل اسلام کے لشکر میں ہو، حربی نے اپنے قلعہ سے مسلمان سے گفتگو کی اور معاملات فاسدہ میں سے کوئی معاملہ کرلیا تو یہ امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں، البتہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ ہمارے اکثر مشائخ اس مسئلہ میں بھی جواز کے قائل ہیں کیونکہ حربی کا مال مسلمان کے حق میں (جب کہ وہ دھوکہ فریب سے نہ ہو) مباح ہے۔

دارالحرب سے، دارالاسلام کی اگر صلح ہوجائے تب بھی اس قسم کے معاملات کی اجازت ہے۔

دارالحرب والوں نے، دارالاسلام والوں سے اگر صلح کر رکھی ہو، اس زمانہ میں دارالاسلام کا باشندہ ان کے یہاں گیا اور ایک درھم کو دو کے عوض بیچ دیا، تو اس میں حرج نہیں ہے، کیونکہ اس صلح سے دارالحرب دارالاسلام نہیں بن جاتا، مسلمانوں کے لئے تو

(۱) ۳/۱۲۶۔ (۲) شرح السیر الکبیر ۳/۲۲۶۔

دارالحرب والوں کا مال ان کی خوشی اور رضامندی کے بغیر لینا حرام ہے کیونکہ اس میں غدر (دھوکہ فریب) پایا جاتا ہے لیکن جب انہوں نے خوشی اور رضامندی سے یہ معاملہ کیا ہے تو دھوکہ وفریب کے معنی معدوم ہوگئے، اور ان سے لیا ہوا مال مباح ہوگیا۔(۱)

دارالحرب میں عقود فاسدہ کرنے کا مسئلہ صرف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہی نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے بلکہ امام مالکؒ بھی اسکے قائل ہیں، البتہ امام موصوف کے نزدیک ایک شرط ہے وہ یہ کہ دارالاسلام سے دارالحرب کی صلح نہ ہو

سئل الامام مالک هل بين المسلم اذا دخل دارالحرب وبين الحربى ربا فقال الامام هل بينكم وبينهم هدنة فقالوا لا فقال مالک فلا بأس فى ذلک. (۲)

امام مالکؒ سے سوال کیا گیا کہ مسلم اگر دارالحرب میں داخل ہو تو وہاں کے لوگوں سے ربا لے سکتا ہے امام نے دریافت کیا کہ کیا تم میں اور ان میں صلح ہے؟ کہا گیا نہیں تو آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ شامی کے فتویٰ میں بھی حربیوں سے اس قسم کے معاملات کی اجازت آپ پڑھ چکے ہیں لیکن یہ واضح رہے کہ ربوا اور قمار بنص قرآن کریم حرام ہیں اور ان دونوں پر سخت وعیدیں آئی ہیں اس لئے اس قسم کے معاملات سے احتراز کرنا ضروری ہے، انتہائی ضرورت ومجبوری کی حالت میں اس طرح کی گنجائش سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اس موقعہ پر ایک غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، لہٰذا اس کے ازالہ کے لئے ہم مولانا سید مناظر حسن گیلانی کی عبارت نقل کردینا کافی سمجھتے ہیں:

اس مسئلہ کی بنیاد پر ایک اور معاشی سوال پیدا ہوگیا یعنی غیر اسلامی حکومت

(۱) شرح السیر الکبیر ۳/۲۲۸۔ (۲) المدونۃ الکبریٰ ص ۳/۲۸۱۔

کے کسی غیر مسلم باشندہ کا روپیہ کسی ایسے ذریعہ سے جو اسلامی قانون کی رو سے لین دین کا قانونی اور شرعی ذریعہ نہیں ہے، مثلاً ربوا یا قمار یا ازیں قبیل کے کسی اور غیر شرعی ذریعہ سے کسی مسلمان کے قبضہ میں آجائے تو کیا قانوناً یہ مسلمان اس کا مالک ہوسکتا ہے یا نہیں چونکہ یہ ایک جائز اور مباح مال پر قبضہ ہے اور مباح و جائز مال کے مملوک ہونے کے لئے صرف قبضہ کافی ہے، مثلاً جنگل کے کسی پرندے کا شکار کر کے قبضہ کر لینا اس پرندے کے مالک ہونے کے لئے کافی ہے، اسی لئے امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے کہ اس قسم کے اموال کا مسلمان قانونی طور پر مالک بن جاتا ہے اور یہی ان کا وہ مشہور نقطہ نظر ہے جس کی وجہ سے حنفی فقہ کی عام کتابوں میں **لا ربوا بین المسلم و الحربی** (۱) (الحربی غیر مسلم وغیر اسلامی حکومت کا باشندہ اور المسلم (اسلامی حکومت کا باشندہ میں ربوا (سود) نہیں ہے) کا ذکر پایا جاتا ہے، گویا یہ بین الاقوامی قانون کی ایک دفعہ ہے عوام چونکہ اس کے اصل منشاء سے واقف نہیں ہیں اس لئے ان کو حیرت ہوتی ہے کہ ربوا (سود) جب اسلام میں حرام ہے تو ہر جگہ ہر شخص سے لینا حرام ہونا چاہئے، حربی یعنی غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ اس کے جائز ہونے کا کیا معنی مگر سچی بات یہ ہے کہ حربی کے ساتھ یہ معاملہ ربوا کا معاملہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایک مباح مال کو قبضہ میں لے کر اسے ملک بنانا ہے، اسی طرح یہ مسئلہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شرعی غلام اور آقا کے درمیان بھی اگر ربوا کا معاملہ کیا تو وہ بھی ربوا نہ ہوگا، ظاہراً اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باوجود ربوا اور سود ہونے کے امام نے اس کو حرمت سے مستثنیٰ کیا ہے۔

بھلا! ایک مجتہد کو اس کا حق کیا ہے بلکہ بات یہ ہے کہ قانوناً غلام کا مال آقا ہی کا

(۱) ہدایہ ۵/۱۹۴۔

مال ہے الخ۔ (۱)

۹۔ اگر یہ کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہو تو کیا اس بنا پر کہ خزانہ حکومت میں رعیت کے ہر فرد کا حق ہوتا ہے، زیر بحث معاملہ میں سود کی رقم عطیہ حکومت قرار پا کر ربوا کے حدود سے خارج ہوسکتی ہے۔

اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ خزانہ حکومت میں رعیت کے ہر فرد کا حق ہوتا ہے تب بھی سود کی رقم ربوا کے حدود سے خارج نہیں ہوتی، کیونکہ حق ملک اور ملک میں بنیادی فرق ہے، حق ملک کو ملک قرار نہیں دیا جا سکتا، ملک کی صورت میں ربوا نہیں ہوتا، مثلاً شرعی غلام اور آقا اگر کوئی سودی معاملہ کریں تو اس کو سود نہیں کہا جائے گا کیونکہ ملک غلام اور آقا کی واحد ہے، اسی طرح اگر ایک شخص اپنی آمدنی کو مختلف مدوں میں تقسیم کر کے الگ الگ رکھ لے پھر ایک مد کے لئے دوسری مد سے قرض لے اور اس میں کچھ رقم بطور سود لگا لے تو وہ سود نہیں کہلائے گا (۲)، علاوہ ازیں جن دو شخصوں کے درمیان شرکت کا معاملہ ہو اور وہ اس مال مشترک میں آپس میں کوئی سودی معاملہ کر لیں تو وہ بھی ناجائز نہیں ہوگا، شرکت کی وجہ سے دونوں کی ملک ایک سمجھی جائے گی۔

حق ملک کی صورت میں سود ہوگا مثلاً میاں بیوی جب کہ دونوں کی املاک علیحدہ ہوں اگر آپس میں کوئی سودی لین دین کریں تو حرام اور ناجائز متصور ہوگا حالانکہ بیوی کو اپنے شوہر کے مال میں بقدر نفقہ حق ملک ہوتا ہے۔ علی ھذا القیاس باپ اور لڑکا اگر آپس میں ربوا کا معاملہ کریں تو اس پر حرام کا حکم لگایا جائے گا اور یہ کہنا کہ ''لڑکے کے مال میں باپ کا حق ہے اور ارشاد رسول ہے: **انت و مالک لابیک** (۲) اس معاملہ کو ربوا کے حکم سے خارج نہیں کر سکتا۔

(۱) اسلامی معاشیات ص ۴۰۸۔ (۲) یعنی اس کے پاس اپنی چار مدیں ہیں ایک مد سے قرض لے کر پھر اضافہ کے ساتھ واپس کرتا ہے تو اس کو سود کے دائرہ میں نہیں مانا جائے گا کیونکہ ملک ایک ہے، سود میں تبدیلی ملک ضروری ہے۔ (مسعود)۔ فتح الباری ۵/۲۵۰۔

ملک العلماء ربوا جاری ہونے کی شرائط کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

ومنها ان لا يكون البدلان ملكاً لاحد المتبايعين فانه لا يجرى الرباء وعلى هذا يخرج العبد الما ذون اذا باع مولاه درهما بدرهمين وليس عليه دين انه يجوز لانه اذا لم يكن عليه دين فمافى يده لمولاه فكان البدلان ملك المولى فلا يكون هذا بيعاً فلا يتحقق الربا اذ هو مختص بالبياعات وكذلك المتفاوضان اذا تبايعا درهماً بدرهمين يجوز لان البدل من كل واحد منهما مشترک بينهما فكان مبادلة ماله بماله فلا يكون بيعاً ولا مبادلة حقيقة. (۱)

بدلین معاملہ کرنے والوں میں سے ایک ہی کی ملک نہ ہوں (اگر ایسا ہوگا) تو سود جاری نہیں ہوگا، مثلاً عبد ماذون (۲) اگر اپنے آقا کو ایک درہم کے مقابلہ میں دو درہم بیچ دے اور غلام پر کسی کا دین نہ ہو تو یہ معاملہ جائز ہے، کیونکہ دین نہ ہونے کی صورت میں غلام کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کے آقا کی ملک ہے لہٰذا بدلین آقا کی ملک ہے، اس لئے بیع ہی نہیں ہوئی، تو ربوا بھی نہیں ہوگا، کیونکہ ربا بیع کے ساتھ خاص ہے اسی طرح دو شریک (شرکت مفاوضہ کرنے والے) جب اس طرح کا معاملہ کریں تو وہ بھی جائز ہے کیونکہ بدل مشترک ہے اس لئے یہاں حقیقۃً بیع ہی نہیں ہے۔

حقیقت ملک اور حق ملک کا فرق ایک مسئلہ سے واضح ہوگا، مسئلہ یہ ہے کہ بائع

(۱) البدائع والصنائع ۵/۱۹۳، ملک العلماء سے مراد علماء کاسانی ہیں۔

(۲) وہ غلام جس کو اس کے آقا نے تجارت کی اجازت دی ہو۔

(فروخت کرنے والا جب خریدنے والے سے کہے کہ میں نے تجھ کو یہ مال فروخت کر دیا، اس کو ایجاب کہا جاتا ہے، ایجاب کے بعد خریدنے والے کو حق ہوتا ہے کہ وہ اس معاملہ کو قبول کرے یا نہیں، بائع کے ایجاب کے بعد خریدنے والے کو قبول کرنے کا حق معاملہ کی مجلس تک باقی رہتا ہے، لیکن اگر بائع ایجاب کرنے کے بعد جب کہ مشتری نے قبول نہ کیا ہو اپنے ایجاب سے رجوع کر لے تو وہ رجوع کر سکتا ہے، اس صورت میں مشتری کا حق قبول سوخت ہو جائے گا اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ مشتری کو جب مجلس کے اختتام تک حق قبول ہے تو بائع کو ایجاب سے رجوع نہیں کرنا چاہئے، اس اعتراض کا جواب صاحب عنایہ اس طرح دیتے ہیں کہ مشتری کو حق ملک حاصل ہے اور بائع کو حقیقت ملک اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے، حقیقت ملک اعلیٰ ہے اور حق ملک ادنیٰ لہٰذا اعلیٰ ادنیٰ کو سوخت کر دے گا۔ چنانچہ فرمایا۔

فالجواب ان الايجاب اذا لم يكن مفيداً للحكم وهو الملک كان الملک حقيقةً للبائع وحق التملک للمشترى وهو لا يمنع الحقيقة لكونها اقوىٰ من الحق لا محالة. (۱)

اس کا جواب یہ ہے کہ ایجاب سے جب کہ حکم یعنی ملک حاصل نہیں ہوتی تو ملک حقیقت کے لحاظ سے بائع کو ہے اور حق ملک مشتری کو، حق ملک حقیقت ملک کو منع نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ حق سے قوی تر ہے۔

۱۱۔ فرض کیجئے بیمہ کا کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہے، ایک شخص بیمہ پالیسی خریدتا ہے اور میعاد میں اصل مع سود کے وصول کرتا ہے لیکن سود کی رقم بصورت ٹیکس یا چندہ خود حکومت کو دے دیتا ہے۔

سود کو لینا حرام ہے اس لئے اس کو لے کر پھر واپس کر دینا اس حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔

(۱) عنایۃ برحاشیہ فتح القدیر ۵/۷۸۔

۱۲۔ بیمہ دار اگر سود کی رقم بغیر نیت ثواب کسی دوسرے شخص کو امداد کے طور پر دے دیتا ہے تو اس صورت میں انشورنس کا معاملہ کیا جائز ہوگا۔

اس صورت میں بھی انشورنس کے کاروبار کی اجازت نہیں ہے، الا یہ کہ غلط فہمی کی بناء پر اگر انشورنس کا معاملہ کرے اور اس سے رقم وصول ہو جائے تو یہی طریقہ ہے کہ کسی شخص کو بلا نیت ثواب امداد کے طور پر دے دے۔

۱۳۔ اگر انشورنس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو کیا مصالح وحاجات مذکورہ کو سامنے رکھ کر اس کا کوئی بدل ہو سکتا ہے جس میں مصالح مذکورہ موجود ہوں اور اس پر عمل کرنے سے ارتکاب معصیت لازم نہ آئے اگر ہو سکتا ہے تو کیا انشورنس کی مروجہ شکل میں کیا کوئی ایسی ترمیم ہو سکتی ہے جو اسے معصیت سے خارج کر دے اور مصالح مذکورہ کو فوت نہ کرے اگر ہو سکتی ہے تو کیا

(الف) اس کا بدل پچھلے صفحات میں ہم بتلا چکے ہیں۔

(ب) جب تک کہ ربوا اور قمار موجود ہے، معصیت کے دائرہ سے خارج ہونا مشکل ہے۔

بیمہ مروجہ میں دو صورتیں جائز ہیں:

(۱) ڈاکخانہ کا بیمہ، یہ جائز ہے کیونکہ ودیعت میں داخل ہے، یہ بات قابل غور ہے اس زمانہ میں ڈاکخانہ میں بھی اضافہ ملتا ہے جو اضافہ سود کے زمرہ میں مانا جائے گا۔

(۲) جہاز ران کمپنی اگر بیمہ بھی کرے اور مال کی ضمانت دے دے تو مال تلف ہونے کی صورت میں اس کو ضامن بنایا جا سکتا ہے، اور نقصان کا معاوضہ لیا جا سکتا ہے جب کہ تاجر نے اس کمپنی کے جہاز میں اپنا مال بھیجا ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

ولی حسن

خادم مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی

۱۷/رجب ۱۳۸۴ھ

جواب: مولانا یوسف بنوری صاحبؒ

بیمہ اور اس کے مالہ و ماعلیہ کی جس انداز سے اس فاضلانہ جواب میں تنقیح کی گئی اور از روئے قواعد اسلامیہ کی رو سے جو حل پیش کیا گیا وہ قابل صد تعریف ہے اور میرے نزدیک یہ جواب بالصواب ہے، دراصل اسلامی حکومت کے نہ ہونے سے یہ سارے ہی مشکلات پیش آتے ہیں حکومت غیر اسلامی ہو تو یقیناً اس اہم کام کی دقتیں پیش آئیں گی، دقت غیر اسلامی نظام نے پیدا کی ہے، اسلامی نظام کا کیا قصور ہے، یورپ کا سرمایہ دارانہ نظام اور غیر اسلامی معاملات اور یہودی معاشرہ کے معاملات اسلام کے نظام میں کیونکر فٹ ہوں گے، بہر حال اس وقت تک تو کچھ سمجھ میں آ سکتا ہے، اس کے پیش نظر یہ جواب آخری حل ہے **ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا**۔

محمد یوسف منور

جواب: مفتی محمود حسن صاحب

مفتی جامع العلوم، پٹکاپور، کانپور

الجواب وبیدہ ازمۃ الحق والصواب

حامداومصلیا ومسلما، بیمہ کی جملہ اقسام مسؤلہ دومفسدوں سے خالی نہیں، قمار، ربوا اور یہ دونوں ممنوع ہیں، ان کی ممانعت فروعی اور استنباطی نہیں بلکہ منصوص اور قطعی ہے ﴿یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ﴾(۱) الآیۃ ﴿وحرم الربوا﴾ (۲) الآیۃ، یہ حرمت محکم ہے جس میں نسخ کا احتمال نہیں اس لئے شبہ ربوا سے بھی بچنے کا حکم ہے، ''عن عمر بن الخطابؓ ان آخر ما انزلت آیۃ الربوا وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبض ولم یفسرھا لنا فدعوا الربوا والریبۃ ''(۳) رواہ ابن ماجۃ والدارمی مشکوٰۃ شریف ص۲۴۶ قال المحشی قولہ آخر ما انزلت ای آیۃ تعلقت بالمعاملات آیۃ الربوا یعنی ھی ثابتۃ غیر منسوخۃ لکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبض ولم یفسر ھالنا بحیث یحیط بجمیع جزئیا تھا ومواردھا فینبغی لکم ان تدعوا الربوا وما یشتبہ الامر فیہ تورعا و احتیاطا ھذا ما یفھم من ظاھر سوق العبارۃ وقال الطیبی یعنی ان ھذہ الآیۃ ثابتۃ غیر منسوخۃ غیر مشتبھۃ فلذلک لم یفسرھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاجروھا علی ماھی علیہ ولا ترتابوا فیھا واترکوا الحیلۃ فی حل الربوا. لمعات ومرقاۃ

(۱) سورہ مائدہ:۹۰۔ (۲) سورہ بقرہ:۲۷۵۔
(۳) تخریج الاحیاء۲/۱۸۸۔

آیۃ تحریم نازل ہونے پر سابقہ بقایا سود وصول کرنے کی بھی ممانعت کردی گئی اور اس کو بمنزلہ شرط ایمان قرار دیا گیا، ﴿وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین﴾(۱) الآیۃ اس کے بعد بھی جو لوگ سود لینے سے باز نہ آئیں ان کے لئے اعلان جنگ ہے، ﴿فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ﴾(۲) آلایۃ۔ جس بدن میں حرام مال سے گوشت پیدا ہو وہ نار جہنم ہی کے لائق ہے، جان بوجھ کر سود کا ایک درہم لینا چھتیس دفعہ زنا کرنے سے بھی شدید ہے، عن عبداللہ بن حنظلۃ غسیل الملائکۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''درھم ربوا یا کلہ الرجل اشد من ستۃ وثلاثین زنیۃ'' رواہ احمد والدارقطنی وروی البیہقی فی شعب الایمان ''عن ابن عباسؓ وزاد وقال من نبت لحمہ من السحت فالنار اولی بہ'' مشکوٰۃ شریف ۲۴۶ سود کے ستر اجزاء ہیں سب سے ہلکا جزء اپنی ماں سے بدفعلی کرنے کے برابر ہے ''عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الربوا سبعون جزء ایسرھا ان ینکح الرجل امہ'' مشکوٰۃ شریف ص۲۴۶، امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں قرآن پاک میں سب سے زیادہ خوفناک آیت آیۃ الربوا ہے ﴿یا أیھا الذین آمنوا لا تاکلوا الربوا اضعافاً مضاعفۃ واتقوا اللہ لعلکم تفلحون واتقوا النار التی اعدت للکافرین﴾ الآیۃ(۳)۔ کان ابوحنیفۃ یقول: ھی اخوف آیۃ فی القرآن حیث اوعد اللہ المومنین بالنار المعدۃ للکافرین ان لم یتقوہ فی اجتناب محارمہ. الخ۔ مدارک التنزیل(۴)، سود لینے والے، سود دینے والے، سود کا رقعہ لکھنے والے، سود کی گواہی کرنے والے سب پر لعنت آئی ہے، اور سب کو گناہ میں برابر قرار دیا گیا ہے، عن جابر قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء رواہ مسلم مشکوٰۃ شریف ص۲۴۴، مقروض اگر قرض کے دباؤ میں کوئی ہدیہ پیش کرے تو وہ ہدیہ بھی ربوا ہے، نام بدلنے سے حقیقت نہیں

(۱) سورہ بقرہ:۲۷۸۔ (۲) سورہ بقرہ:۲۷۹۔ (۳) سورہ آل عمران:۱۳۰۔
(۴) مدارک التنزیل ۱/۲۹۱۔

بدلتی، "عن ابی بردة بن موسی قال قدمت المدینة فلقیت عبدالله بن سلامؓ قال انک بارض فیها الربوا فاش فاذا کان لک علی رجل حق فأهدی الیک حمل تبن أو حمل شعیر أو حمل قت فلا تأخذه فإنه ربوا، رواة البخاری، مشکوة ص ۲۴۶، ہدیہ مالی کے علاوہ بھی مقروض سے کسی اور منفعت کے قبول کرنے کی اجازت نہیں، عن أنس قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم إذا قرض أحدکم قرضا فأهدی إلیه أو حمله علی الدابة فلا یرکبه ولا یقبلها إلا أن یکون جری بینه وبینه قبل ذلک ۔ رواہ ابن ماجۃ والبیہقی فی شعب الایمان، مشکوٰۃ شریف ص ۲۴۶، سود خوار کے حشر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے ۔ ﴿الذین یاکلون الربوا لا یقومون الا کما یقم الذی یتخبطه الشیطان من المس﴾ الآیۃ ۔(۱)

جن مصالح کی خاطر بیمہ کا سوال کیا گیا ہے ان کے بالمقابل مفاسد بھی کچھ کم وزنی نہیں جن کو نظر انداز کیا جا سکے، مصالح و مفاسد جب متعارض ومتقابل ہوں تو دفع مفاسد کی رعایت جلب مصالح پر مقدم ہوتی ہے (۲)، محرم اور مبیح میں تعارض ہو تو ترجیح محرم کو ہوتی ہے، بلکہ بسا اوقات موجب اور محرم میں بھی تعارض کے وقت ترجیح محرم کو ہوتی ہے، درأ المفاسد اولی من جلب المصالح فاذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالباً لان اعتناء الشرع بالمنهیات اشد من اعتنائه بالمامورات و کذا قال علیه الصلوٰة والسلام اذا امرتکم بشئ فاتوا منه ما استطعتم واذا نهیتکم عن شئی فاجتنبوه الی قوله من لم یجد سترة ترک الاستنجاء ولو علی شط نهر لان النهی راجح علی الامر. (الاشباه والنظائر ص ۶۲) مصالح بیمہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیمہ دار اپنے نزدیک ایسی تدبیر مستحکم کر لیتا ہے کہ گویا اب قدرت کی ہر گرفت سے محفوظ ہے یہاں تک کہ اس کو رزق

(۱) سورۃ البقرۃ: ۲۷۵۔ (۲) قاعدہ فقہیہ ہے درء المفاسد اولیٰ من جلب المنافع۔

طلب کرنے کے لئے رزاق کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت نہیں رہی اور اپنے بعد بھی اولاد کی پرورش کے لئے وہ رب کا محتاج نہیں رہا وہ خود ہی رزاق ہے، خود ہی رب ہے الی غیر ذالک، بیمہ پر اعتماد کرنے کے بعد وہ مالک الملک جل وعلی کی ذات وصفات کے اعتماد سے بے نیاز ہے، یہ تصور بنیاد ہے دہریت کی۔ العیاذ باللہ۔

حالانکہ سودی کاروبار بیمہ وغیرہ کے ذریعہ سے نہ مسلمان ترقی کر سکتا ہے جب کہ حدیث شریف میں "عن ابن مسعودؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان الربوا وان کثر فان عاقبته تصیر الی قل . الخ" مشکوٰۃ شریف ص ۲۴۶ اور نہ ہی مال محفوظ ہو سکتا ہے، ﴿یمحق الله الربوا﴾ الآیۃ، لہذا سودی کاروبار کو مال مسلم کی حفاظت یا ترقی کا ذریعہ تجویز کرنا نصوص قرآن وحدیث کا مقابلہ کرنا ہے یا ان سے صرف نظر پر مبنی ہے۔

مسلمان کی ترقی اور کامیابی بلا امتیاز حرام وحلال مال جمع کرنے اور تجارت کو فروغ دینے میں ہرگز نہیں بلکہ اس کی ترقی اور کامیابی احکام شرع کی پابندی میں ہے۔ حرام اور لعنت کے کاموں سے پوری طرح پرہیز کرنے میں ہے۔

آئے دن فسادات کا ہنگامہ جو پیش آتا رہتا ہے جن میں مکانات اور کارخانوں کو جلا کر تباہ کر دیا جاتا ہے یہ کچھ ناگہانی، آپ سے آپ پیش آنے والے حوادث نہیں بلکہ بندوں کی سرکشی اور طغیانی پر جبار وقہار کی طرف سے منظور شدہ رحیمانہ تنبیہات ہیں جو سرکش بیمہ دار احکام اسلام سے آزاد محفوظ ہو جاتے ہیں ان کا محافظ بیمہ نہیں بلکہ ان کی حفاظت محافظ حقیقی نے فرمائی ہے خواہ ان کو ڈھیل دینے کے لئے خواہ کسی اور وجہ سے، اگر موسم خراب ہوا اور امرود سے ہیضہ پھیلنے کا اندیشہ ہو تو حفظان صحت کے ماہرین حدود میونسپلٹی میں امرود کا داخل ہونا بند کرا دیتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ کچھ جانور گدھے بندر وغیرہ امرود کھا رہے اور ان کو کسی وجہ سے ہیضہ نہیں ہو رہا ہے، تو ان کی حرص میں انسانوں کو بھی اجازت دے دی جائے، ﴿والذین کفروا یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام والنار مثوی

لهم(۱) **الاية فلما نسوا ماذكروا به فتحنا عليهم ابواب كل شيئى حتى اذا فرحوا بما اوتوا اخذ ناهم بغتة فاذا هم مبلسون فقطع دابر القوم الذين ظلموا والحمد لله رب العالمين﴾**۔الآیۃ (۲)

ایسے حضرات کی فہرست بھی کچھ کم طویل نہیں جن کے گردوپیش کے کارخانے جلا کر سیاہ کردیئے گئے مگر وہ بغیر بیمہ کے بھی اللہ کے فضل سے پوری طرح محفوظ رہے، عارف رومیؒ فرماتے ہیں ”ایں سببہا درنظرہا پردہ است، درحقیقت فاعل ہر شے خدااست“۔

اگر نصوص سے اغماض کرتے ہوئے بیمہ ہی کو بالفرض حفاظت مال کا ذریعہ قرار دیا جائے تو جو مال لعنت وغضب الٰہی لے کر آئے اس سے کس خیر کی توقع کی جاسکتی ہے، لعنت کے ساتھ تو مسلمان کے لئے قارون کا خزانہ، شداد کی جنت، فرعون کی سلطنت سب نا قابل قبول ہے، مستقلاً سود کا مال کما کما کر بغیر نیت ثواب دوسروں کو کھلانے کی بھی اجازت نہیں زہر کھانا جرم ہے، زہر خورانی بھی جرم ہے۔

بیمہ کا سود اگر وصول نہ کیا جائے تو اس سے اس کمپنی کو ترقی اور تقویت ہوگی جس کی اجازت نہیں، ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان الآیۃ اگر کوئی شخص مستامن وغیرہ مخصوص حالات میں کسی بلا میں گرفتار ہوجائے اور اس کے لئے شرعی اسباب کے پیش نظر کسی قول پر کوئی گنجائش نکل سکتی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کو عام ضابطہ بنا کر منہی عنہ کو ختم کردیا جائے۔

دارالحرب تسلیم کرنے کے باوجود مولانا گنگوہی، مولانا تھانویؒ، مفتی عزیز الرحمٰن وغیرہم اکابر نے سود کی اجازت نہیں دی، حکومت جو چندہ اور ٹیکس وصول کرتی ہے اگر وہ حق ہے تو اس کا ادا کرنا واجب ہے اس میں سود کی رقم نہیں دی جاسکتی اگر ناحق ہے تو وہ ظلم ہے ایک ظلم حکومت نے کیا دوسرا رعایا کا ہوگا کہ سود لے کر وہ رقم ادا کرے گی تو حاکم ومحکوم دونوں ہی ظالم ہو کر بہت جلد تباہ ہوں گے، جو کام حکومت کے ذمہ ہیں اور حکومت ان کو انجام نہ دیتی ہو تو خود حکومت پر اس کا وبال ہوگا اور حکومت ظالم قرار پا کر اس کی سزا بھگتے گی،

---

(۱) سورہ محمد:۱۲۔ (۲) سورہ انعام:۴۴۔

حکومت کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے سود لے کر اس کو انجام دینا اپنے سر سود کا وبال لینا ہے، اور حکومت کو آئندہ کے لئے بے فکر کردینا ہے کہ یہ کام تو بیمہ دار کرایا کرتے ہیں، جو کام حکومت کے ذمہ نہیں مثلاً دینی مدارس اور کتب خانے قائم کرنا اور چلانا تو اگر ان کو حرام مال سے قائم کیا گیا اور چلایا جائے گا تو ایسے لوگ تیار ہوں گے جو خود ہی حرام وحلال کی تمیز سے بے بہرہ ہوں گے اور قوم کو حرام سے روکنے کا جذبہ بھی ان میں نہیں ہوگا، لہٰذا اس مقصد کے لئے بھی بیمہ پالیسی خریدنا درست نہیں۔

مشین کے رواج عام سے جو حوادث بکثرت پیش آتے ہیں ان سے حفاظت کی قوت بھی آدمی کو دے دی گئی ہے۔

ما من مسلم كسا مسلما ثوبا الا كان فى حفظ من الله ما دام عليه منه خرقة رواہ احمد والترمذی، مشکوٰۃ شریف ص۱۶۹، اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے بعد کوئی طاقت نہیں جو نقصان پہنچا سکے، لوہا، آگ، پانی، پتھر، ہوا یا ان کے جوہر یہی سب چیزیں ہیں جو مشین سے استعمال کی جاتی ہیں، ان سب سے قوی اور شدید چیز بھی تو کوئی ہے، ”**عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لما خلق الله الارض جعلت تحيط فخلق الجبال فقال بها عليها فاستقرت فعجبت الملائكة من شدة الجبال فقالوا يا رب هل من خلقك شئى اشد من الجبال قال نعم: الحديد فقالوا يا رب هل من خلقك شئى اشد من الحديد قال نعم النار فقالوا يا رب هل من خلقك شئى اشد من النار قال نعم الماء فقالوا يا رب هل من خلقك شئى اشد من الماء قال نعم الريح فقال يا رب هل من خلقك شئى اشد من الريح قال نعم ابن آدم تصدق صدقة بيمينه يخفيها من شماله**“ رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث غریب مشکوٰۃ شریف ص۱۷۰، اگر آدمی یقین کے ساتھ جانے کہ رزاق صرف اللہ ہے اور تقویٰ اختیار کرے حرام سے بچے تو کبھی بھی حرام کی طرف رخ نہ کرے اور رزق بھی کافی ملے گا، ”**عن ابن مسعود قال اقرأنى رسول**

الله صلى الله عليه وسلم انى انا الرزاق ذو القوة المتين" رواہ ابوداؤد والترمذی وقال ھذا حدیث حسن صحیح، مشکوٰۃ شریف ۵۳، "**عن ابی ذرؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال انى لاعلم آية لو اخذها الناس بها لكفتهم ومن يتق الله يجعل له مخرجا ويرزقه من حيث لا يحتسب**" رواہ احمد وابن ماجۃ والدارمی مشکوٰۃ شریف ص ۴۵۳، جتنی روزی جس کے لئے تجویز شدہ ہے وہ اس کو اس طرح تلاش کرتی اور اس تک پہنچتی ہے، جس طرح موت، کوئی کسی کی روزی چھین نہیں سکتا، "**عن ابى الدرداءؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الرزق ليطلب العبد كما يطلبه اجله**" رواہ ابونعیم فی الحلیۃ (مشکوٰۃ شریف ۴۵۴) باعزت طریق پر تمام ضروریات پوری ہونے اور اغناء قلبی وسکون کی صورت بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادی ہے جس کو اختیار نہ کرنے سے کبھی سکون میسر نہیں آتا۔

"**عن انس ان النبى صلى الله عليه وسلم قال من كانت نيته طلب الآخرة جعل الله غناه فى قلبه وجمع له شمله واتته الدنيا وهى راغبة ومن كانت نيته طلب الدنيا جعل الفقر بين عينيه وشتت عليه امره ولا ياتيه منها الا ما كتب**" رواہ الترمذی ورواہ احمد والدارمی عن ابان عن زید بن ثابت مشکوٰۃ شریف ص ۴۵۴، حلال روزی حاصل کرنے کی ایسی تدبیر بیان فرمائی گئی ہے جس میں کوئی خدشہ نہیں اور حلال روزی ملنا یقینی ہے مگر افسوس اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا بنک اور بیمہ پر اعتماد کیا جاتا ہے، "**عن ابن عباسؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان جاع او احتاج فكتمه الناس كان حقا على الله عز و جل ان يرزقه رزق سنة من حلال**" مشکوٰۃ شریف ۴۴۹، حرام سے بچنے والا حاجتمند خدا کے نزدیک محبوب ہے اور حرام طریق پر کمانے والا مالدار ملعون ہے، "**عن عمران بن حصين قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله يحب عبده المومن الفقير المتعفف ابا العيال**" (مشکوٰۃ شریف ۴۴۹) 'مال کی تباہی کا سبب اس طرح بیان کیا گیا ہے "عن

عائشة قالت: سمعت رسول الله ﷺ يقول: ما خالطت الزكوة مالا قط إلا أهلكته "رواہ الشافعی والبخاری فی تاریخ الحمیدی، **وزاد قال يكون قد وجب عليك صدقة فلا تخرجها فيهلك الحرام الحلال** (مشکوٰۃ شریف ص ۱۵۷)

مسلمان کا اصل سرمایہ اعتماد علی اللہ، مکی زندگی کے لئے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نمونہ بنا گیا لہٰذا اپنے مسائل کو سیرت پاک سے حل کرنے کی ضرورت ہے، نہ کہ غیر اقوام سے **ولا تمدن عينيك إلى ما متعنا به أزواجا فيهم زهرة الحيوة الدنيا لنفتنهم فيه ورزق ربك خير وابقى والله الموفق لما يحب و يرضى.**(۱)

محمود عفی عنہ
مدرسہ جامع العلوم
حررہ العبد

●●●

(۱) طٰہٰ: ۱۳۱۔

جواب: سید مہدی حسن

مفتی عام دارالعلوم دیوبند

الجواب:

اول یہ گذارش ہے کہ میں گیارہ ماہ سے مرض فالج میں مبتلا ہوں، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا سب دشوار ہے، مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنا ان کے لئے اٹھنا سب دشوار ہے۔

(۱) بیمہ انشورنس کرانے میں سود بھی ہے، باعتبار حقیقت واصل کے **لعدم اشتراط المساواة فی الجانبین فیما یجب فیه المساواة.**

(۲) اور قمار بھی ہے صورت کے لحاظ سے **لانه تعليق الملك على الخطر والمال فی الجانبین.**

(۳) جان کے بیمہ میں رشوت بھی ہے، **لان المال فيه عوض من غير متقوم وهو النفس** اور ظاہر ہے کہ سود اور قمار اور رشوت اسلام میں حرام ہیں۔

(۴) بیمہ کرانے میں اعانت علی المعصیت بھی ہے کہ وہ اگرچہ حکومت ہی کیوں نہ ہو سب سودی کاروبار کرتی ہیں پر یہ دیکھنا ہے، بیمہ میں جو قسطیں جمع کی جاتی ہیں وہ قرض ہیں یا امانت یا شرکت فی التجارۃ اور شرکت کی کون سی قسم ہے، اگر قرض ہے تو زیادتی کل قرض جر نفعا فهو ربا[۱] کے تحت میں داخل ہو کر ناجائز ہے، امانت ہے تو زیادتی کسی کو منافع میں دینے پر ضمان واجب ہے جو مثل ومساوات کے ساتھ ادا کرنا ہوگا زیادتی جائز نہ ہوگی، اور ظاہر ہے کہ کمپنی بیمہ کرانے والے کو شریک تجارت نہیں سمجھتی کہ جانبین سے اس کے متعلق کوئی قول وقرار نہیں ہوا ہے۔

(۱) حافظ ابن حجرؒ نے تلخیص حبیر ۳/۳۴ اور امام بیہقی نے سنن ۵/۳۵۰ میں الفاظ کے فرق کے ساتھ "کل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربوا" کے طور پر ذکر کی ہے "کل قرض جر نفعا" کے بارے میں علماء کا کہنا ہے کہ اس طرح کے الفاظ حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

(۵) پھر بعض صورتوں میں امانت یا قرض کے روپیہ کو، شرکت کے مال کو ضبط کر لینا اور مال کو نہ دینا امانت اور قرض یا شرکت کے روپیہ کو واپس نہ کرنا معاملہ عقد، امانت اور قرض وشرکت کے خلاف ہے اس بنا پر سوال میں جتنے فائدے ذکر کئے گئے ہیں سب ختم ہو جاتے ہیں ان جملہ امور کے ہوتے ہوئے بیمہ کرانا جائز نہیں ہے، پھر ان سے بینک و ڈاک خانہ میں روپیہ جمع کرنے کا فرق معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں روپیہ کسی حال میں ضبط نہیں ہوتا دونوں ایک نہیں ہیں جیسا کہ سوال میں اشارہ کیا گیا ہے، بیمہ میں قسط وار ادا کرنا ضروری ولازمی ہے ورنہ روپیہ ادا کردہ ضبط ہو جائے گا بنک اور ڈاک خانہ میں اگر چند سال تک جمع نہ کیا جاوے تو جمع کردہ رقم ضبط نہیں ہوگی جس وقت چاہے لے سکتا ہے بیمہ کمپنی سے لے نہیں سکتا یہ ضبط ہو جاتا ہے۔

(۶) بیمہ کی دو صورتیں ہیں اگر کسی ملک کے قانون میں بیمہ کرانا لازمی ہو تو ایسی صورت میں مجبوری کی بنا پر بیمہ کرا لینا چاہئے پیسے جمع کرانے کے لئے فوٹو کھنچوانا ہوتا ہے، کہ قانوناً مجبوری ہے اس طرح بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا بیمہ کرانا ضروری ہوتا ہے جیسے پٹرول کی دوکان، ہوائی جہاز، پانی کے جہاز، موٹر وفین کا بیمہ کرانا ضروری ہوتا ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ بیمہ کرانا اختیاری ہو اس میں مذکورہ احکام جاری ہوں گے یہ خیال کہ پس انداز روپیہ بعد کے وارثوں کو مل جائے گا اور ان سے زندگی درست ہو جائے گی اور وہ محتاج نہیں رہیں گے، یا تعلیم اولاد میں آسانی ہو جائے گی ایک مسلمان کے لئے زیبا نہیں ہے، جب کہ وہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کا وعدہ کر لیا ہے، اس کے قبضہ میں جملہ اسباب ہیں، **یبسط الرزق لمن یشاء** الآیۃ (سورۃ الرعد:۲۶) بسا اوقات روپیہ حاصل ہوتا ہے اور پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو جاتا ہے جس پر واقعات شاہد ہیں بلکہ یہ بھی دیکھا ہے کہ بیمہ کرانے والوں نے زیادتی روپیہ کے لالچ میں خودکشی کر لی اور مکان یا دوکان میں خود ہی آگ لگا دی یا مال چوری کرا دیا ہے جس پر قانوناً مقدمات قائم ہوتے اور لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں، بیمہ کرانے کی ایک تیسری صورت بھی ہے کہ جس ملک میں آئے دن قتل وغارت گری آتش زنی لوٹ مار کے

واقعات پیش آتے رہتے ہیں یا بظن غالب ہر وقت خطرہ رہتا ہے ایسے ملک میں بھی بیمہ کرالینے کی اصولاً گنجائش ہوگی اس لئے کہ حدیث میں ہے "**لاضرر ولا ضرار فی الاسلام**" (۱) **الضرر یزال مهما امکن، المشقة تجلب التیسر، اذا ابتلی ببلیتین فیختار بما هو الا هون فیهما ، الحاجة تنزل منزلة الضرورة والحرج یدفع مهما امکن، والضرورات تبیع المحظورات، فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیه، یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔**(۲)

وفی القنیة والبغیة یجوز للمحتاج الاستفراض بربح، الأشباه والنظائر غیر مسلم ممالک میں ان قواعد کا لحاظ کرتے ہوئے فقہاء نے ان معاملات کی اجازت دی ہے جس کی بنیاد دراصل **لا ربوا بین الحربی والمسلم** پر ہے اور جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلم کے قبضہ میں ہو اور جملہ اختیارات بسط وکشادا سی کو حاصل ہوں وہ دار اسلام نہیں ہے چنانچہ کافی میں اس کی تصریح موجود ہے اس کو دار الحرب سے تعبیر کیا ہے، ہنگامی حالات کے پیش آنے سے احکام میں نرمی اور تغیر پیدا ہوجاتا ہے اگرچہ حکم اصلی بیمہ کے متعلق وہی ہے جو ابتداء میں عرض کیا گیا ہے لیکن اختلاف دار اور ہنگامی حوادثات کی بناء پر اصول بالا کے تحت گنجائش کا امکان ہے **ولا ربوا بین المسلمین ثمه اسلما ولم یهاجرا الینا الخ.** درمختار.

اعتیاض عن الحقوق المجردة ناجائز ہے، لیکن نزول من الوظائف کی اجازت کی کتاب الوقف میں شامی وغیرہ نے تصریح کی ہے جس کو پگڑی سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ دار اسلام کا حکم ہے انھیں اصول کے ماتحت داخل ہے جس کو حموی نے شرح اشباہ میں مفصل ذکر کیا ہے اس لئے موجودہ حالات کی بنا پر مع حکومت غیر مسلمہ کے بیمہ کی گنجائش ہے، میرے خیال میں اتنی مقدار سے آپ کے جملہ نمبروں کا جواب ماخوذ ہوسکتا ہے اس وقت اتنے ہی لکھنے کی قدرت ہے۔ **واللہ تعالیٰ ، اعلم بالصواب.**

سید مہدی حسن غفر اللہ

(۱) حوالہ گذر چکا ہے۔ (۲) الاشباہ والنظائر۔

جواب: محمد ہارون بلوچستانی، پاکستان
مع تصویب مولانا ظفر عثمانیؒ صاحب

الجواب ومنه الصدق والصواب

بیمہ فی نفسہ قمار اور سود دونوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام اور ناجائز ہے، بیمہ املاک اس میں کمپنی جو مالک کو خاص صورتوں میں معاوضہ دیتی ہے صورۃً تو وہ عوض ہے، اس مال تلف شدہ کا مگر واقع میں عوض ہے، اس رقم کا جو ماہانہ یا سالانہ داخل کی جاتی ہے، کیونکہ مقصود وہی ہے ورنہ مال ضائع سے ان کو کیا نفع ہوسکتا ہے، پس باعتبار صورت تو یہ قمار ہے **لان تعلیق الملک علی الخطر و المال فی الجانبین** اور باعتبار حقیقت کے سود ہے **لعدم اشتراط المساواة فی الجانبین فیما یجب فیه المساواة**(۱) اور قمار اور سود دونوں حرام ہیں پس یہ معاملہ یقیناً حرام ہے، اسی طرح جان کا بیمہ وہ صورۃً رشوۃ ہے، **لان المال فیه عوض من غیر ملتزم وهو النفس او العضو اور حقیقةً** سود ہے، تعیین بامر فی المال لیکن اگر حکومت خود اس کی ذمہ داری اٹھا کر خزانہ عامہ سے بیمہ کرلے پھر اس کے جواز میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، اسلئے کہ خزانہ شاہی میں ہر ایک کا حق ہوتا ہے، لہٰذا اس وقت اپنے سے لینا ہے اور اپنے کو دینا ہے، جس میں ربوا کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ شرائط ربوا میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مال مشترک نہ ہو، **کما هو مصرح فی کتب الفقه ، بدایع الصنایع میں هے ، وکذلک الشریکان شرکة العنان اذا تبایعا درهما بدرهمین من مال الشرکة جاز**

(۱) پہلے گذر چکا ہے۔

لما قلنا ، پھراس وقت تینوں صورتیں بیمہ کے جائز ہوں گی، باقی رہا یہ سوال کہ مستامن مسلمان ہندو کمپنیوں کے ساتھ عقد بیمہ کرسکتا ہے یا نہیں، تو اس کے بارے میں ہمارے ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، امام اعظم اور امام محمدؒ جواز کی طرف چند قیود کے ساتھ گئے ہیں، اور امام ابو یوسف عدم جواز کی طرف، اس کو اصل میں **لاربوا بین المسلم والحربی** کہتے ہیں، بناءعلی ہذا ہمارے علماء میں سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ صادر فرمایا اور عدم جواز کا قول کیا ہے کما ہو مصرح فی فتاواہ، اور دوسرے علماء طرفین کے قول پر بلحاظ شرائط فتویٰ صادر فرما چکے ہیں، قائلین بالجواز کے نزدیک شرائط جواز یہ ہیں۔ (۱) وہ محل دار الحرب ہے (۲) معاملہ ربوا یا بیمہ کا حربی کافر سے ہو دو مسلمانوں کے درمیان نہ ہو (۳) بشرطیکہ ظن غالب میں مسلمان کا نفع زیادہ ہو کافر کا نہ ہو۔ **فقط واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔**

احقر محمد ہارون بلوچستانی
خادم دار الافتاء، دار العلوم الاسلامیہ
الجواب صحیح: ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

●●●

جواب: محمد یحییٰ قاسمی

(مفتی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ)

الجواب:

انشورنس کے عدم جواز کی عموماً دو وجہ بتائی جاتی ہے، قمار اور ربوا، لیکن یہ دونوں لفظ شرعی ہیں اور جب تک کسی بھی معاملہ پر قمار اور ربوا کا شرعاً اطلاق نہ ہو، اسے قمار اور ربوا کی حد میں داخل کرنا، اور عدم جواز کا حکم لگانا صحیح نہ ہوگا، یہ ملک دار الحرب ہے اور یہاں کے رہنے والے غیر مسلم حربی ہیں، اس مسئلہ پر ''ہندوستان اور دار الحرب'' میں کافی روشنی ڈالی گئی ہے جو منسلک ہے۔

غیر ذمی کافر مباح الدم والاموال ہے، نہ عصمت موثمہ حاصل ہے اور نہ عصمت مقومہ اور جب تک ان میں سے کوئی عصمت حاصل نہ ہو مباح ہوگا اس لئے کہ عدم عصمت اور اباحت ایک ہی چیز ہے، دونوں میں کوئی فاصلہ نہیں ہے، ملا علی قاریؒ نے شرح نقایہ میں اموال کی اباحت ثابت کرتے ہوئے اس کی تفسیر عدم عصمت سے کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

لان الاصل فی الاموال الاباحة وعدم العصمة (شرح نقایہ ص۳۹۲/ج۲)۔

عصمت موثمہ وہ ہے جس کے ازالہ سے گناہ ہو اور عصمت مقومہ وہ ہے جس کے ازالہ سے بدل اور ضمان لازم آئے۔

غیر ذمی کافر کے نفس کو عصمت موثمہ کیوں حاصل نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر چہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عصمت موثمہ کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن جب اس نے کفر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے کفر کی بنا پر عصمت زائل کردی، عنایہ میں ہے: **العصمة**

الموثمة بالادمية..... الا ان الله تعالیٰ ابطل ذلک فی الکافر بعارض الکفر (عنایہ برحاشیہ فتح القدیر ص۳۵۶/ ج۴)

فتح القدیر میں ہے:

(ولان العصمة الموثمه) فی الاصل (بالادمية) لا بوصف الاسلام (لانه خلق متحملا اعباء التكاليف والقيام بها) لا يمكن الا مع (حرمة التعرض له) وانما زالت بعارض الكفر (فتح القدیر ص۳۵۶/ ج۴ قبیل باب العشر والخراج)۔

ان دونوں عبارتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر کافر مباح الدم ہے چونکہ اس نے کفر اختیار کر کے اپنی عصمت موثمہ زائل کر دی لیکن محض کفر عصمت موثمہ کو زائل کرنے والا نہیں ہے، بلکہ کفر حراب عصمت موثمہ کا مزیل ہے، ہدایہ میں ہے:

والمبيح كفر المحارب دون المسالم (هدايه ص۵۴۷/ ج۴ باب **ما يوجب القصاص وما لا يوجبه**)۔

عنایہ میں ہے:

لا نسلم ان مطلق الكفر مبيح بل المبيح كفر المحارب (عنایۃ بر حاشیہ فتح القدیر ص۲۵۶/ ج۸-۵)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ذمی چونکہ مسالم ہے اس لئے اس کا کفر مبیح قتل نہیں ،غیر ذمی کا کفر مبیح قتل ہے۔

حربی قوم سے اگر مسلمانوں کی صلح ہوجائے ، جب بھی وہ حربی ہی رہتے ہیں ، مستامن اور ذمی کے حکم میں نہیں آتے۔

مبسوط میں ہے:

بالموادعة ما خرجوا من ان يكونوا اهل حرب (مبسوط ص۹۷/ ج۱۰)۔

ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر غیر ذمی کافر محارب ہے:

غیر ذمی کافر کے مال میں عصمت موثمہ کیوں نہیں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مال کی عصمت موثمہ نفس کی عصمت موثمہ کے تابع ہے اور جب نفس کے اندر عصمت موثمہ نہیں بلکہ اباحت ہے تو مال میں بدرجہ اولیٰ اباحت ہوگی، ہدایہ میں ہے:

العصمة الموثمه بالادمية .....والاموال تابعة لها (ہدایہ ۵۶۸/ ج۲)۔

غیر ذمی کافر کے نفس کو عصمت مقومہ کیوں حاصل نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس کی عصمت مقومہ مال کی عصمت مقومہ کے تابع ہے، ہدایہ میں ہے:

اما المقومة فالاصل فيها الاموال .....فكانت النفوس تابعة (ہدایۃ ص۵۶۸/ ج۲)

اور جب تک مال کی عصمت مقومہ ثابت نہ ہو نفس کی عصمت مقومہ ثابت نہ ہوگی اور مال کے اندر اصل اباحت ہے، شامی میں ہے:

وصاحب الھدایۃ **انما اثبت الاباحة بعد ورود الشرع بمقتضى الدليل يعنى إنما مقتضى الدليل اباحتها لكن تثبت العصمة بعارض وقد صرح بذلک فی اصول البزدوی حيث قال بعد ورود الشرع الاموال على الاباحة بالاجماع مالم يظهر دليل الحرمة لان الله تعالیٰ اباحها بقوله خلق لكم ما فی الارض جميعا.** (ردالمحتار ص۲۶۷/ ج۳ باب استیلاء الکفار)

ردالمحتار میں دوسری جگہ ہے:

والحل هو الاصل فی الاشياء. (ردالمحتار ص۱۹۴/ ج۴ باب الربوا)

عنایہ میں ہے:

وبيانه ان العصمة فی المال لكل من تثبت له من المسلم والكافر انما تثبت على منافاة الدليل فان الدليل وهو قوله تعالیٰ هو الذی خلق لكم ما فی الارض جميعا يقتضی ان لا يكون مالا معصوما لشخص ما (عنایۃ

برحاشیہ فتح القدیر ص۳۳۹ ج۴)۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ مال خواہ کسی شخص کا ہو مباح الاصل ہے اگر اس کو عصمت مقومہ حاصل ہوگی معصوم ہوگا ورنہ مباح رہے گا۔

مال کے اندر عصمت مقومہ احراز بدارالإ سلام سے حاصل ہوتی ہے۔

مبسوط میں ہے:

العصمة المقومة تكون بالاحراز (ص ۳۰/ج ۱۰) والاحراز بالدار لا بالدين. (ص۵۳/ ج۱۰)۔

ہدایہ میں ہے:

ثم العصمة المقومة فى الاموال بالاحراز بالدار لان العزة بالمنعة فكذلك فى النفوس الا ان الشرع اسقط اعتبار منعة الكفرة لما انه اوجب ابطالها. (ہدایہ ص۵۶۸/ ج۲)

غیر ذمی کافر کے مال کو عصمت مقومہ حاصل نہیں اس لئے کہ اموال میں عصمت مقومہ احراز بدارالإ سلام سے حاصل ہوتی ہے جو حربی کے مال کو حاصل نہیں اس لئے حربی کا مال اپنی اصلی خلقت پر مباح الاصل باقی ہے۔

ان تمام عبارتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ غیر ذمی کافر کا نفس اور مال مباح ہے، نفس اس لئے کہ وہ محارب ہے اور مال اس لئے کہ احراز بدارالاسلام نہیں اور جب مال کے اندر عصمت مقومہ اور موثمہ کوئی نہ ہو تو پھر ربوا اور قمار کا اطلاق اس پر کیسے جائز ہوگا، جب کہ دونوں کے لئے مال کا محرز اور متقوم ہونا ضروری ہے، حربیوں سے دارالحرب میں تمام عقود فاسدہ مسلمانوں کو کرنا مباح ہے بشرطیکہ غدر کا ارتکاب نہ ہو اس لئے کہ حربیوں کے مال کو نہ عصمت مقومہ حاصل ہے اور نہ عصمت موثمہ جس کی تفصیل گذر چکی۔ ہدایہ میں ہے:

لا ربا بين المسلم والحربى فى دار الحرب .....لنا قوله عليه الصلوٰة والسلام لا ربا بين المسلم والحربى فى دارالحرب ولان

مالهم مباح فى دارهم فبأى طريق اخذه المسلم اخذ مالا مباحا اذا لم يكن فيه غدر. (ہدایہ باب الربوا)

فتح القدیر میں ہے:

(لان مالهم مباح) واطلاق النصوص فى مال محظور وانما يحرم على المسلم اذا كان بطريق الغدر فاذا لم ياخذ غدراً (فأى طريق ياخذه حل) بعد كونه محرما. (فتح القدیر باب الربوا قبیل باب الحقوق ص۳۰۰/ ج۵)

ردالمحتار میں ہے:

وفى السير الكبير وشرح حيث قال واذا دخل المسلم دار الحرب بامان فلا باس بان ياخذ منهم اموالهم بطيب انفسهم بأى وجه كان لانه انما اخذ المباح على وجه عرى عن الغدر فيكون ذلك طيبا له والا سير والمستامن سواء حتى لو باعهم درهما بدرهمين او باعهم ميتة بدراهم اواخذ مالا منهم بطريق القمار فذلك كله طيب له الخ، ملخص فانظر كيف جعل موضوع المسئلة الاخذ من اموالهم برضاهم فعلم ان المراد من الربوا والقمار فى كلامهم ما كان على هذا الوجه وان كان اللفظ عاما لان الحكم يدور ما علته غالباً (ردالمحتار ص۲۰۸ باب الربوا قبیل باب الحقوق)۔

ردالمحتار میں دوسری جگہ ہے:

(تنبيه فى كافى الحاكم وان بايعهم الدرهم بالدرهمين نقدا او نسيئةً او بايعهم بالخمر والخنزير والميتة فلا باس بذلك لان له ان ياخذ اموالهم برضاهم فى قولهما ولا يجوز شيئى من ذلك فى قول ابى يوسف ؒ۔الخ (ردالمحتار ص۲۷۰/ ج۳ باب المستامن)

مبسوط میں ہے:

قال رحمه الله ذكر عن مكحول عن رسول الله صلى الله عليه

وسلم قال لا ربابين المسلمين وبين اهل الحرب فی دارالحرب وهذا الحديث وان كان مرسلا فمكحول فقيه ثقة والمرسل من مثله مقبول وهو دليل لابی حنيفة ومحمد رحمهما الله فی جواز بيع المسلم الدرهم بالدرهمين من الحربی فی دار الحرب وعند ابی يوسف والشافعی رحمهما الله لا يجوز وكذلك لو باعهم ميتة او اخذ منهم مالا بالقمار فذلك المال طيب له عند ابی حنيفة ومحمد رحمهما الله خلافا لابی يوسف والشافعی رحمهما الله (مبسوط باب الصرف فی دارالحرب (ص۵۶/ ج۱۴)۔

شمس الائمہ سرخسی نے امام ابوحنیفہ اور امام محمد علیہما الرحمۃ کے مسلک کی تائید میں تین واقعہ بیان کیا ہے ایک حضرت عباسؓ ابن عبدالمطلب کا دوسرا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تیسرا خود حضور صلی اللہ علیہ سلم کا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے واقعہ کے راوی خود ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، فرماتے ہیں کہ حضرت عباسؓ اسلام لانے کے بعد مکہ چلے گئے اور وہاں ربا کا کاروبار کرتے تھے اور اپنے اس فعل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپاتے تھے، اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباسؓ کی اس فعل ربا کی خبر بھی نہ تھی، تو پھر اس واقعہ سے جواز پر استدلال کس طرح صحیح ہوگا، اس لئے کہ حضورؐ کو فتح مکہ کے موقعہ پر تو یہ خبر ہو چکی تھی کہ حضرت عباسؓ ربا کا کاروبار کرتے تھے اور اس وجہ سے حضورؐ نے اپنے خطبہ میں فرمایا: واول ربا یوضع ربا العباس بن عبدالمطلب آخر اس موقعہ پر یا اس کے بعد حضورؐ نے حضرت عباس کے اس فعل پر نکیر کیوں نہ فرمائی، اور انہیں اس مال کی واپسی کا حکم کیوں نہیں دیا، کم از کم توبہ ہی کا حکم کیوں نہ فرمایا، غالبًا اسی واسطے۔

مبسوط میں لکھا ہے:

ما لم ينهه عنه دل ان ذلك جائز. (مبسوط، باب صرف فی دارالحرب

ص۵۷/ ج۱۴)۔

اس خطبہ میں جو حکم آپ نے دیا وہ صرف یہ ہے کہ اب ربا نہ لیا جائے جو باقی بھی رہ گیا ہے وہ ساقط کر دیا گیا کیوں؟ اس لیے کہ اب مکہ دارالاسلام بن چکا تھا، اور جس طرح ابتداء عقد ربا دارالاسلام میں ناجائز ہے اسی طرح بقاء بھی ناجائز ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مال کو عصمت مقومہ احراز بدارالإسلام سے حاصل ہو چکی ہے۔

مبسوط میں ہے:

لان العصمة الثابتة بالاحراز كما تمنع ابتداء العقد تمنع القبض بحكم العقد (مبسوط ص۵۹/ ج۱۴)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ جس کو سورہ روم کے تحت صاحب روح المعانی اور بیضاوی وغیرہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے، یہ ہے کہ جب فارس کے مجوسی روم کے نصاریٰ پر غالب آ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ اور صحابہ کرام کو دکھ ہوا، اور مکہ کے کافروں کو خوشی ہوئی، جب کفار مکہ کی ملاقات صحابہ کرام سے ہوئی تو انہوں نے صحابہ سے کہا کہ تم بھی اہل کتاب ہو اور روم کے نصاریٰ بھی اہل کتاب ہیں، اور ہم امی ہیں اور فارس کے مجوسی بھی امی، ہمارے امی بھائی تمہارے اہل کتاب بھائی پر غالب آ چکے ہیں، اگر ہماری تمہاری جنگ ہوئی تو ہم بھی تم پر غالب آئیں گے، اس پر سورہ روم کی چند آیتیں نازل ہوئیں، کہ روم اگرچہ ابھی فارس سے مغلوب ہو چکا ہے، لیکن چند سال بعد ہی روم پھر فارس پر غالب آ جائے گا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کفار کے پاس گئے اور فرمایا کہ لوگوں کو خوشی ہے کہ فارس کے مجوس روم کے نصاریٰ پر غالب آ گئے ہیں، خوش مت ہو خدا تمہاری آنکھیں ٹھنڈی نہیں رکھے گا، خدا کی قسم روم پھر فارس پر غالب آئے گا، اس کی خبر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دی ہے، اس پر ابی بن خلف بولا تو جھوٹا ہے ابوبکر صدیق نے فرمایا کہ اے خدا کے دشمن تو جھوٹا ہے آؤ شرط لگاؤ، دس قلانص میری جانب سے اور دس قلانص تمہاری جانب سے، تین سال میں اگر روم غالب آ گیا تو دس قلانص تم ادا کرنا اور اگر فارس غالب

آ گیا تو دس قلانص ہم ادا کریں گے، اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی، حضور نے فرمایا: ماہذا ذکرت، ایسا تم نے کیا ذکر کر دیا، بضع تو تین سے نو تک استعمال ہوتا ہے، جاؤ مال مشروط بڑھاؤ اور مدت زیادہ کرو، جب ابوبکر صدیق لوٹ کر کفار کے پاس گئے تو ابی بن خلف بولا شاید تم کو اپنے کئے پر ندامت ہوئی، حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا نہیں آؤ میں شرط کا مال بڑھاؤنگا، اور مدت بھی زیادہ کروں گا، سو قلانص شرط اور مدت نو سال رہی، ابی بن خلف بولا منظور ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق کے بارے میں جب ابی بن خلف کو یہ خطرہ ہوا کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں گے تو اس نے حضرت ابوبکر صدیق سے کفیل مانگا، حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے صاحبزادے عبدالرحمٰن کو کفیل بنا دیا، جب ابی بن خلف جنگ احد میں جانے لگا تو حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کفیل مانگا، ابی بن خلف نے بھی کفیل بنا دیا، جب ابی بن خلف جنگ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں زخمی ہوا اور اس میں مر گیا اسکے بعد روم جب اپنی مغلوبیت کے ساتویں سال فارس پر غالب آیا تو ابی بن خلف کے ورثاء نے حضرت ابوبکر صدیق کو بلا بھیجا وہ آئے اور مال مشروط لے گئے، اور حضور کی خدمت میں پیش کیا حضورؐ نے کیا فرمایا، مبسوط کے الفاظ یہ ہیں:

فامره بأكله

حضرت ابوبکر صدیق نے اگر چہ یہ شرط تحریم جوا کے حکم سے پہلے لگائی تھی جیسا کہ ترمذی نے سورہ روم کی تفسیر کے تحت بیان کیا ہے، لیکن اس مال کی وصولی صلح حدیبیہ کے بعد ہوئی ہے اسلئے کہ روم فارس پر صلح حدیبیہ ہی کے موقع پر غالب آیا، جیسا کہ معالم التنزیل میں ہے:

فاذا غلبت الروم على فارس عند ذلک .....وجاء الخبر الى رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الحديبية ففرح ومن معه (معالم التنزیل ص ۶۸۷/ پ ۲۱ سورہ روم)

اور ظاہر ہے کہ مال مشروط کی وصولی اس کے بعد ہی ہوئی ہوگی اس سے پہلے کفار مکہ دینے والے کب تھے، اور شراب وقمار کی آخری اور قطعی حرمت جو انما الخمر والمیسر (الی) **فهل انتم منتهون** کے ذریعہ ہوئی ہے وہ ایک روایت کی بنیاد پر ۴ھ میں اور ایک روایت کی بنیاد پر ۵ھ میں غزوہ احزاب (خندق) کے کچھ دن بعد ہوئی ہے، جیسا کہ معالم التنزیل میں ہے:

فانزل الله تعالىٰ تحريم الخمر فى سورة المائدة الى قول فهل انتم منتهون وذلک بعد غزوة الاحزاب بايام. (معالم التنزیل ص ۹۳ سورہ بقرہ)

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میسر کی حرمت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق نے یہ مال مشروط وصول کیا ہے اور یہ معلوم ہے کہ ربا اور عقود فاسدہ میں جس طرح ابتداء عقد ناجائز ہے اسی طرح قبضہ بحکم العقد بھی ناجائز ہے مبسوط میں ہے:

ان الاسلام يمنع القبض كما يمنع ابتداء العقد (مبسوط ص ۵۹/ ج ۱۴)

اگر یہ لینا جائز نہ تھا تو حضرت ابوبکر صدیق نے یہ مال لیا کیسے؟ اور اگر لے لیا تو حضورؐ نے واپسی کا حکم کیوں نہیں دیا؟

یہاں پر یہ شبہ بھی نہیں کیا جائے (جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ بالفعل محارب قوم سے اس طرح کے عقود جائز ہیں اور جو بالفعل محارب نہ ہو اس سے جائز نہیں) کہ مکہ کی کافر قوم بالفعل محارب تھی اس لئے مال لے لینا جائز تھا اس لئے کہ صلح حدیبیہ میں دس سال تک جنگ نہ کرنے پر صلح ہو چکی تھی اور یہ مال صلح حدیبیہ کے بعد لیا گیا، صلح کے بعد کسی قوم کو یہ کہنا کہ بالفعل محارب تھی کسی طرح درست نہیں، ہاں بالقول ضرور محارب تھی، صلح حدیبیہ میں دس سال جنگ بند کرنے کی صلح ہوئی تھی اس کی دلیل مبسوط میں ہے:

ان النبى صلى الله عليه وسلم صالح اهل مكة عام الحديبية على ان وضع الحرب بينه وبينهم عشر سنين (مبسوط ص ۳۷/ ج ۱۰)

روم کے غالب آنے کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ جنگ بدر کے موقعہ پر فارس روم پر غالب آیا اور جنگ بدر ۲ھ میں ہوئی ہے تو جب روم کا غلبہ فارس پر ۲ھ میں ہو چکا تھا، تو پھر جنگ احد کے موقعہ پر جب ابی بن خلف جنگ میں شریک ہونے جا رہا تھا تو حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر نے ابن خلف سے کفیل کیوں طلب کیا مال وصول کرنا چاہئے تھا اس لئے کہ مال مشروط کی ادائیگی تو ایک سال پہلے واجب ہو چکی تھی اس لئے کہ جنگ احد شوال ۳ھ میں ہوئی ہے اور پھر مال کی اصولی ابی بن خلف کے ورثاء سے ہوئی ہے، ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روم کا غلبہ فارس پر اور مال کی وصولی دونوں جنگ احد کے بہت بعد صلح حدیبیہ کے موقعہ کی بات ہے جو ذیقعدہ ۶ھ میں ہوئی ہے) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس مال مشروط کے لینے کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضور نے فرمایا تصدق بہ جیسا کہ بیضاوی نے سورہ روم کے تحت ذکر کیا ہے، اور بعض روایت میں هذا السحت تصدق به بھی ہے، ان دونوں روایتوں کا ذکر روح المعانی میں بھی ہے، سورہ روم کے تحت ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے هذا السحت تصدق به فرمایا یا صرف تصدق بہ فرمایا تو پھر اس سے جواز پر استدلال کیسے درست ہوگا اس کا جواب بھی روح المعانی ہی میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ اگر هذا السحت تصدق بہ کی روایت صحیح مان لی جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کے صدقہ کرنے کا حکم دیا جو جائز نہیں ہے، خصوصاً جب کہ مال مختلط بھی نہیں اور صاحب مال کا علم بھی ہے تصدق بہ کی روایت میں بھی حکم صدقہ کا حرمت کی وجہ سے نہیں ہوگا ورنہ پھر وہی اشکال ہوگا کہ حرام مال کے صدقہ کا حکم حضورؐ نے کیسے دیا اس لئے یا تو یہ روایت صحیح نہ مانی جائے یا پھر اس کے معنی ایسے متعین کئے جائیں جس سے یہ اعتراض نہ ہو اس بنا پر روایت کو صحیح مان کر تصدق بہ کا حکم کسی مصلحت کی بنا پر ہوگا اور هذا السحت تصدق به میں هذا السحت کے معنی حرام کے نہیں بلکہ ما یکون سبب للعار والمروة کے ہوں گے جیسا کہ کسب الحجام سحت میں ہیں اس سلسلہ میں روح المعانی کے الفاظ یہ ہیں:

كيف يومر بالتصدق بالحرام الغير المختلط بغيره وصاحبه معلوم وفي مثل ذلك يجب رد المال عليه .....وكاني بك تمنع صحة هذه الرواية واذا لم تثبت صحتها يبقىٰ الامر بالتصدق وحينئذ يجوز ان يكون لمصلحة رأها رسول الله صلى الله عليه وهو تصدق بحلال.....أما إذا كان ذلك قبل تحريم القمار كما هو المعول عليه فظاهر وربما يقال على تقدير الصحة ان السحت ليس بمعنى الحرام بل بمعنى ما يكون سببا للعار والنقص في المروة حتى كانه يسحتها اى يستا صلها كما في قوله صلى الله عليه وسلم كسب الحجام سحت فقد قال الراغب ان هذا لكونه ساحتا للمروة لا للدين فكانه صلى الله عليه وسلم راى ان تمول ذلك وان كان حلالا مخل بمروة ابى بكر صديق رضي الله عنه فاطلق عليه السحت وكان عليه الصلوٰة والسلام على ثقة من صلاح الصديق رضى الله عنه وانه اذا امره بالتصدق بما ياخذه ونهاه عن تمول لم يخالفه وقيل السحت هنا بمعنى ما لا شيئى على من استهلكه وهو احد اطلاقا ته كما في النهاية والمراد هذا الذى لا شيئى عليك اذا استهلتكه وتصرفت فيه حسب ما تشاء تصدق به كانه عليه الصلوٰة والسلام بعد ان اخبر الصديق رضى الله عنه بانه لا مانع له من التصرف فيه حسب ما يريد ارشده الى ما هو الاولى والأحرى فقال تصدق به وهو كما ترى ..... واما تفسير السحت بالحرام والتزام القول بجواز التصدق بالحرام فمما لا يلتفت اليه اصلا فتأمل. (روح المعانی ص ۴۲۷ تا ص ۴۲۸ سورہ روم)

تیسرا واقعہ خود حضور صلی اللہ علیہ کا ہے کہ حضور نے حضرت رکانہ سے جو فتح مکہ کے موقعہ پر اسلام لائے ہیں ان کے اسلام لانے سے پہلے مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

مصارعت (کشتی) فرمائی تھی اور شرط بکریوں کی تھی، آپ نے انہیں مصارعت میں مغلوب فرمایا، اور بعض روایتوں میں ہے کہ تین دفعہ مغلوب فرمایا، اور شرط کے مطابق ان سے بکریاں لے لیں، لیکن پھر تکرما بکریاں واپس فرمادیں۔

ان تینوں واقعہ کے ذکر کرنے کے بعد صاحب مبسوط نے دلیل عقلی بیان فرمائی، اور امام ابو یوسف اور امام شافعی علیہما الرحمۃ کے استدلالات کا جواب بھی دیا ہے۔ اگر بصیرت حاصل کرنا ہو تو باب الصرف فی دار الحرب جلد ۱۴ مکمل دیکھ لیا جائے، تینوں واقعہ اور طرفین علیہما الرحمۃ کی دلیل عقلی مبسوط کے الفاظ میں یہ ہیں:

وحجتنا فی ذلک ما روینا وما ذکر عن ابن عباس رضی الله عنه وغیره ان رسول الله صلی الله علیه قال فی خطبته کل ربا کان فی الجاهلیة فهو موضوع واول ربا یوضع ربا العباس بن عبدالمطلب وهذا لان العباس رضی الله عنه بعد ما اسلم رجع الی مکة وکان یربی وکان یخفی فعله عن رسول الله صلی الله علیه وسلم فما لم ینهه عنه دل ان ذلک جائز وانما جعل الموضوع من ذلک ما لم یقبض حتی جاء الفتح وبه نقول وفیه نزل قوله تعالیٰ وذروا ما بقی من الربوا (سورة البقرة :۲۷۸)، قال محمد وبلغنا ان ابابکر صدیق رضی الله عنه قبل الهجرة حین انزل الله تعالیٰ الم غلبت الروم قال له مشرکوا قریش یرون ان الروم تغلب فارس فقال نعم فقالوا هل لک ان تخاطرنا علی ان نضع بیننا وبینک خطراً فان غلبت الروم اخذت خطرنا وان غلبت فارس اخذنا خطرک فخاطرهم ابوبکر رضی الله عنه علی ذلک ثم أتی النبی صلی الله علیه وسلم واخبره فقال اذهب الیهم فزد فی الخطر وأبعد فی الاجل ففعل ابوبکر رضی الله عنه وظهرت الروم علی فارس فبعث إلی ابی بکر رضی الله عنه أن تعال فخذ خطرک فذهب واخذه فأتی النبی

صلی الله علیه وسلم به فأمره باکله وهذا القمار لا یحل بین اهل الاسلام وقد اجازه رسول الله صلی الله علیه وسلم بین ابی بکر رضی الله عنه وهو مسلم وبین مشرکی قریش لانه کان بمکة فی دار الشرک حیث لا یجری احکام المسلمین ولقی رسول الله صلی الله علیه وسلم رکانة باعلیٰ مکة فقال له رکانة هل لک ان تصار عنی علی ثلث غنمی فقال صلی الله علیه وسلم نعم وصارعه فصرعه الحدیث، إلی ان اخذ منه جمیع غنمه ثم ردها علیه تکرما وهذا دلیل علی جواز مثله فی دار الحرب بین المسلم والحربی وهذا لان مال الحربی مباح ولکن المسلم بالاستیمان ضمن لهم ان لا یخونهم وان لا یاخذ منهم شیئا الا بطیبة أنفسهم فهو یتحرز عن الغدر بهذه الاسباب ثم یتملک المال علیهم بالأخذ لا بهذه الاسباب وهذا لان فعل المسلم یجب حمله علی احسن الوجوه ما امکن واحسن الوجوه ما قلنا. (مبسوط باب الصرف فی دار الحرب ص ۵۷ تا ۵۸/ ج ۱۴)۔

ان تمام تصریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ دار الحرب میں حربیوں کا مال مباح ہے غدر سے بچتے ہوئے ان کی رضامندی سے جو مال لیا جائے وہ مال مباح ہوگا اور اس کا استعمال جائز ہوگا۔

بعض اہل علم کو شبہ ہے کہ یہ ربوا اور قمار ہی ہے وہ بہر حال ناجائز ہے، اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ صورت ربوا و قمار کی ضرور ہے، حقیقتاً ربوا و قمار نہیں ہے، اور جب تک حقیقتاً ربوا و قمار نہ ہو اس پر حرمت کا حکم درست نہ ہوگا، جیسے صلوٰۃ وصوم اگر بغیر وضو اور نیت ادا کیا جائے تو وہ صورت صلوٰۃ وصوم ضرور ہوگی مگر حقیقت میں صلوٰۃ وصوم کا وجود نہ ہوگا، اور نہ اس پر کوئی شرعی حکم لگایا جائے گا، ان تفصیلات کے بعد سوالات کے جوابات نمبر وار درج ذیل ہیں:

۱۔نہیں

۲۔اب اس کی ضرورت نہیں

۳۔تینوں کا حکم ایک ہی ہوگا

۴۔قمار شرعی نہیں صرف صورت قمار ہے جس پر قمار شرعی کا حکم لگانا صحیح نہیں۔

۵۔اس کی بھی ضرورت نہیں۔

۶۔جائز نہیں کہ کمپنی کی اس رقم کو چھوڑ دے جسے وہ سود کے نام سے دیتی ہے اس لئے کہ وہ سود نہیں اور کمپنی اس رقم سے وہ کام کرے گی جس سے مسلمانوں ہی کا نقصان ہے۔

۷۔مال مباح قرار دیا جاسکتا ہے۔

۸۔بالکل جائز ہے۔

۹۔یہاں کوئی فرق نہیں۔

۱۰۔یہاں کی حکومت سے اس طرح جو رقم ملے گی وہ عطیہ نہیں مال مباح کا لینا ہوگا جو جائز ہے۔

۱۱۔الف تاج، لینے کے بعد جو چاہے کرسکتا ہے، جواز تو پہلے ثابت کیا جاچکا۔

۱۲۔یہ رقم سود نہیں کہ اس پر احکام سود کے جاری ہوں اور بغیر نیت ثواب دینے کی ضرورت پڑے، بقیہ کے جواب کی اب ضرورت نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

محمد یحییٰ قاسمی

مفتی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ

●●●

جواب: مفتی محمد ظفیر الدین صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھوالموافق والمعین، بیمہ کی جو تعریف کی گئی ہے اور اس کے مصالح ومفاسد کی جو تفصیل درج کی گئی ہے، اس کو سامنے رکھ کر کتاب وسنت کی روشنی میں ہر پہلو پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ موجودہ حالات میں بیمہ کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے، کسی کاروبار میں امید وخوف کے ملے جلے جذبات سے گریز اور نفع کی یقین دہانی اسلام کے ان بنیادی تاثرات کے سراسر خلاف ہے، جو وہ اپنے پیرو میں پیدا کرنا چاہتا ہے، خدا ترسی، اعتماد علی اللہ، اور مستقبل کی خدا کو سپردگی مضمحل ہی نہیں کرتی، بلکہ بیمہ دار کو ان جذبات وتاثرات سے دور لے جا کر ڈال دیتی ہے، اس طرح اس غیر محدود مالی ترقی کو روک دیتی ہے، جو معمولی سرمایہ سے خدا پر اعتماد کر کے ایک انسان غیر معمولی سرمایہ اور بڑی دولت کما لیا کرتا ہے، اور اس طرح وہ خود اپنی، اپنے خاندان کی، اور فقراء ومساکین کی اس بڑی آمدنی کو محدود کر ڈالتا ہے، جو تجارت، صنعت وحرفت، اور دوسرے جائز ذرائع سے حاصل کرسکتا تھا۔

اسی طرح انسان زندگی کا بیمہ کروا کے کاہل اور ناکارہ بھی بنتا ہے، اور اپنے ان جذبات عروج وترقی کو مردہ کر لیتا ہے، جو وہ دماغی، جسمانی جدوجہد کے ذریعہ حاصل کرسکتا تھا، نیز وہ ایک بہت ہی محدود آمدنی پر قناعت کر کے اپنی توانائی کو کھو دیتا ہے، جو اسے بطور خود کچھ کرنے سے حاصل ہوسکتی تھی۔

بیمہ کمپنی کی جو تفصیل دی گئی ہے کہ وہ بہت سے سرمایہ داروں کی شرکت سے وجود میں آتی ہے، اور بیمہ کرانے والوں کی رقم جمع کر کے سودی کاروبار کے ذریعہ منافع کماتی ہے، اور اپنے شریک سرمایہ داروں پر تقسیم کرتی ہے، اور انہی منافع کا کچھ حصہ بیمہ داروں کو بھی

دے دیا کرتی ہے، اس سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ کمپنی کا منشا مصیبت زدوں یا پریشان حالوں کی امداد نہیں ہے، بلکہ یہ ایک سودی اور جوا کا کاروبار ہے، یقیناً بیمہ دار کو حسب شرائط بعض صورتوں میں نفع (سود) دیتی ہے، لیکن وہ نفع متعین ہوا کرتا ہے، پھر بعض صورتوں میں نفع کم دیتی ہے، اور بعض صورتوں میں زیادہ اور بعض صورتوں میں بیمہ دار کی اصل رقم بھی سوخت کر لیتی ہے، واپس نہیں کرتی، بیمہ دار کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مجبوری کے وقت سلسلہ منقطع کر کے جمع شدہ رقم جب چاہے واپس لے لے۔

ان ساری تفصیلات کو سامنے رکھنے کے بعد یہ فیصلہ آسان ہو جاتا ہے کہ اس بیمہ والے کاروبار کو کسی جائز کاروبار میں داخل نہیں کیا جا سکتا ہے، نہ یہ شرکت کی قسموں میں سے کسی قسم میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ مضاربت میں، بلکہ تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ کار خالص سودی اور قمار کا کاروبار ہے، جن سے اسلام نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے، اور جوا اپنے نتائج کے اعتبار سے سخت مضر اور مہلک ہے۔

خود سوچئے کہ ایک شخص نے زندگی کا بیمہ کرایا، جو چالیس ہزار کا تھا، اور جس کی چالیس روپئے ماہانہ قسط مقرر کی گئی، بیمہ دار نے ابھی دو ہی قسط ادا کی تھی کہ اچانک اس کا انتقال ہو گیا، کمپنی اس صورت میں اس کے ورثاء یا نامزد اشخاص کو چالیس ہزار ادا کرے گی، رقم تو جمع ہوئی تھی صرف اسی روپئے اور ادائیگی ہوئی چالیس ہزار کی، یا خدانخواستہ دو قسط ادا کرنے کے بعد ایسی مجبوری لاحق ہوئی کہ وہ اب بقیہ قسطیں ادا کرنے سے معذور ہے، اس نے آئندہ کے لئے انکار کر دیا، تو اس صورت میں کمپنی اس کے یہ روپئے سوخت کر لے گی، اب خود فرمائیں کہ اسے قمار (جوا) کے سوا دوسرا نام کیا دیا جا سکتا ہے، اور اگر اس نے مدت متعینہ کے اندر چالیس ہزار کی رقم جمع کر دی، اور وہ اس کے بعد زندہ رہا، تو اس صورت میں کمپنی اس کی یہ چالیس ہزار رقم بھی دے گی، اور اوپر سے نفع یا سود کے نام پر کچھ ہزار زیادہ رقم بھی، یہ سود نہیں ہوا تو کیا ہوا؟ حالانکہ یہ دونوں قطعاً حرام ہیں، ارشاد خداوندی ہے:

احل اللہ البیع و حرم الربوا فمن جاء ہ موعظة من ربه فانتهى الخ ، انما

الخمر و الميسر و الانصاب و الازلام رجس من عمل الشيطان ، فاجتنبوه الخ، ربوا اور قمار کی جو تعریف کی گئی ہے وہ اس کاروبار پر پورے طور پر صادق آتی ہے، فقہاء کا اس میں بھی اختلاف نہیں ہے کہ کل قرض جر نفعا حرام۔ (درمختار باب الربا)

بیمہ کا کاروبار ظاہری طور پر مضاربت ہی سے قریب معلوم ہوتا ہے، مگر مضاربت سے دراصل اسے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ مضاربت میں نفع معین نہیں ہوا کرتا ہے، بلکہ غیر محدود ہوتا ہے، پھر مضاربت میں نفع از روئے نسبت ہوتا ہے، یہاں ایسا نہیں ہے بلکہ متعین ہوتا ہے، نسبت کی یہاں کوئی قید نہیں ہوتی، وہاں کبھی نفع ہوتا ہے، کبھی نہیں بھی ہوتا ہے، یہاں ہر صورت میں متعین، پھر مضاربت میں مضارب کو راس المال ہضم کرنے کا اختیار نہیں ہوتا، یہاں ہوتا ہے، کبھی کمپنی راس المال خود کھا جاتی ہے، کبھی دوسرے بیمہ داروں پر تقسیم کرتی ہے، اور کبھی پورا راس المال واپس نہیں ہوتا، فقہاء، مضاربت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

المضاربة شرعاً عقد شركة فى الربح بمال من جانب رب المال وعمل من جانب المضارب ، وركنها الايجاب والقبول الخ و شرطها امور سبعة، كون راس المال من الاثمان هو معلوم العاقدين الخ ، كون راس المال عينا لا دينا الخ ، و كونه مسلما الى المضارب ليمكنه التصرف الخ، و كون الربح بينهما مشاعاً ولو عين قدرا فسدت و كون نصيب كل منهما معلوما عند العقد ومن شروطها كون نصيب المضارب من الربح حتى لو شرط له من راس المال او منه ومن الربح فسدت. الخ (دیکھئے ردالمحتار کتاب المضاربۃ)

پھر یہ بھی مسلم ہے کہ کمپنی اپنے سرمایہ کا بڑا حصہ سودی کاروبار پر لگاتی ہے، اور روپے دے کر سود وصول کرتی ہے، جس کی شریعت میں کہیں سے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

زندگی کے علاوہ دوسری چیزوں کے بیمہ میں بھی کم وبیش یہی ساری خرابیاں پیش آتی ہیں، اس لئے بار بار غور کرنے کے باوجود جواز کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی؟

بیمہ کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ بیمہ دار کے مرجانے کے بعد کمپنی رقم اسی شخص کو دے گی جس کو وہ نامزد کر گیا ہے، خواہ وہ وارث شرعی ہو یا نہ ہو، صرف وہی ہو یا دوسرا اور بھی ہو، حالانکہ از روئے شریعت مرنے کے بعد اس کے مال میں تمام ورثاء کا حق ہوتا ہے، گویا اس طرح کبھی قانون وراثت کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جس طرح فقہاء نے حاجتمندوں کے لئے انتہائی مجبوری میں منافع کی شرط پر قرض لینے کی اجازت دی ہے، یہاں بھی نکل سکتی ہے، حالانکہ دونوں میں کہیں سے کوئی جوڑ نہیں ہے، روپے جمع کرنے والوں کو حاجتمند مضطر سمجھنا انتہائی سادگی ہے۔

اپنا خیال ہے کہ ان لوگوں کی باتوں سے ہرگز متاثر نہیں ہونا چاہئے جو کہتے ہیں کہ شریعت کو زمانہ کے تابع کر دیا جائے، خواہ شریعت کا منشا ہی کیوں نہ فوت ہو جائے، دنیاوی ضرورتوں کو شریعت کے قانون کا پابند نہ بنایا جائے، بلکہ خود شریعت ہی کو دنیاوی ضرورتوں کا پابند بنا دیا جائے۔

جب تک شریعت میں کسی چیز کے جواز کا ثبوت نہ ملے، اسے ہرگز **الضرورات تبیح المحظورات** کے نام سے جائز قرار دینا نہیں چاہئے، اور اس قاعدہ فقہی میں آکر حرام کو حلال قرار دینے کی سعی تو انتہائی جرأت و گستاخی ہے۔

البتہ وہ ممالک جو دارالحرب کے حکم میں ہیں، ان کے متعلق امام اعظم رحمۃ اللہ کا یہ قول موجود ہے کہ وہاں عقود فاسدہ کی اجازت ہے، اگر غدر نہ ہو تو بلکہ رضامندی سے ہو تو سودی کاروبار اور قمار جائز ہے، کیونکہ دارالحرب میں ربوا ہے ہی نہیں، **ولا ربا بین حربی ومسلم مستامن ولو بعقد فاسد اوقمار ثمه لان ماله ثمه مباح فیحل برضاه مطلقا بلا غدر خلافا للثانی ای ابی یوسف والثلاثة ای الائمة الثلاثة۔** (دیکھئے شامی ص ۲۶۰ ج ۴)

مگر احناف میں خود امام ابو یوسف اور ائمہ اربعہ میں دوسرے ائمہ ثلاثہ اس کے

قائل نہیں ہیں، جیسا کہ اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے، پھر مصالح میں اگر صرف روپئے کا جمع کرنا منشا ہو خواہ کسی اہم کے لئے ہو، اس کی صورت دوسری اس سے اہون موجود ہے۔

ہندوستان جسے بعض علماء دارالحرب کے حکم میں مانتے ہیں، اور یہاں مسلمانوں کے جان و مال کو جو یقینی خطرہ آئے دن پیش آتا رہتا ہے، اور بیمہ سے واقعی طور پر اگر جان یا مال مسلم کی حفاظت ہوتی ہے تو یہ مسئلہ یقیناً ایسا ہے کہ اس پر پوری سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ اس کی اجازت دی جائے یا نہیں، جب کہ امام اعظمؒ کا قول ایک مرسل حدیث کے پیش نظر موجود بھی ہے، مگر یہ کام شخص واحد کا نہیں ہے، بلکہ پوری جماعت مل کر غور کرے، اور اگر واقعۃً بیمہ کے ذریعہ اس ملک میں مسلمان کی جان و مال کی حفاظت ہو سکتی ہے تو کوئی فتوی متفقہ طور پر مرتب کرے، یہ درست ہے کہ اصل محافظ رب العالمین ہیں، مگر اس سلسلہ میں ہم پر جو فریضہ عاید ہوتا ہے، اس سے غفلت بھی کسی درجہ میں روا نہیں، لیکن جو کچھ کیا جائے کتاب وسنت کی روشنی میں کیا جائے اور اس کے تمام پہلو کو سامنے رکھ کر اور اس سلسلہ میں جو ضمنی مسائل پیدا ہوں ان کا جواب بھی مرتب کر لیا جائے۔

اب سوالات کے جوابات مندرجہ بالا اجمالی جواب یا تمہید کی روشنی میں یہ ہیں۔

(۱) انشورنس کی مندرجہ حقیقت کے عیاں ہونے کے بعد اس میں قطعاً شبہ نہیں رہتا کہ منافع کے نام سے بیمہ کمپنی بیمہ دار کو جو رقم دیتی ہے وہ ربوا ہے، **الربوا فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال** (شامی باب الربا ص ۲۴۳ ج ۴) **الربا هو لغة مطلق الزیادة وشرعاً فضل ولو حکما خال عن عوض بمعیار شرعی وهو الکیل والوزن الخ مشروط ذالک الفضل لا حد المتعاقدین الخ فی المعاوضة** (الدر المختار علی هامش رد المحتار باب الربا ص ۲۴۳ ج ۴) **وفی الخلاصة القرض بالشرط حرام الخ وفی الاشباه کل قرض جر نفعا حرام** (ایضاً ص ۲۴۳ ج ۴)

(۲) سود کے جواز کی صورت مذکورہ مصالح کے پیش نظر بھی نہیں نکلتی ہے، یہ ایک

نص ہے کوئی اجتہادی مسئلہ نہیں ہے، **احل الله البیع و حرم الربوا۔**

(۳) پورے غور وفکر اور تجزیہ کے بعد معلوم ہوتا ہے تمام بیموں کا شرعی حکم ایک ہی ہے۔

(۴) یقیناً قمار کے حدود میں داخل کر دیتی ہے، قمار کی تعریف اس پر صادق آتی ہے۔

(۵) جواز کی کوئی صورت نہیں ہے، ﴿**انما الخمر و المیسر و الانصاب و الازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ**﴾ (قرآن پاک)

(۶) باایں ہمہ بھی درست نہیں ہے

(۷) جب بیمہ کے لئے مستقل قواعد وقوانین ہیں اور ان کی پابندی بیمہ دار کے لئے اور کمپنی کے لئے ضروری ہے، تو پھر اس کے ایک جزء سود کو امداد واعانت کے خانے میں داخل نہیں کر سکتے ہیں، ایجنٹوں کے ظاہر کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، جب نفس بیمہ ناجائز و حرام ہے تو پھر اس کے سود کے جواز کی صورت نکلنے کا سوال سرے سے غلط ہے، دین میں غلط یا من مانی تاویل اور معنوی تحریف درست نہیں۔

(۸) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دارالحرب میں اس کے لئے گنجائش ہے، مستامن کے لئے بھی اور غیر مستامن کے لئے، مستامن کی صراحت ہے، **لا بین حربی و مسلم مستامن ولو بعقد فاسد او قمار لان ماله ثمه مباح فیحل برضاه مطلقا بلا غدر خلافا للثانی و الثلاثة.** (الدرالمختار علی ھامش ردالمحتار وباب الربا ص ۲۲۰ ج ۴)

البتہ امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ (امام شافعی، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ) دارالحرب میں بھی جائز نہیں کہتے، جیسا کہ محولہ عبارت سے ظاہر ہے،

غیر مستامن کا حکم اس عبارت سے نکلتا ہے، **قلت ومنه یعلم حکم من اسلما ثمه ولم یهاجرا (در مختار) یعنی یعلم مما ذکره المصنف مع تعلیله ان من اسلما ثمه ولم یهاجرا لا یتحقق الربا بینهما ایضا کما فی النهر عن الکرمانی وهذا یعلم بالاولیٰ** (رد المحتار ص ۲۶۱ ج ۴)

والحاصل ان الربا حرام الا فی هذه الست مسائل (در مختار) اولها السید مع عبده و آخرها من اسلما ولم یهاجرا. (شامی ایضا) جب خود ان کے درمیان باہم ربوا نہیں ہے تو حربی کافر کے ساتھ کہاں ہوگا۔

اسی طرح شامی نے اس سے پہلے جہاں صاحب بحر کی غلط تعبیر کا تذکرہ کیا ہے وہاں مجتبیٰ سے صحیح صورت مسئلہ کی یہ نقل کی ہے۔

وفی المجتبیٰ هکذا مستامن من اهل دارنا مسلما کان او ذمیا فی دارهم او من اسلم هناک باشرمعهم من العقود التی لا تجوز. (اس سے آگے کی عبارت یہ ہے ملا کر پڑھیں) **فیما بیننا کالربویات وبیع المیتة جاز عندهما خلافا لابی یوسف** مجتبیٰ کی یہ عبارت بہت واضح ہے کہ غیر مستامن مسلمان بھی اگر دار الحرب میں اس طرح کے معاملات کرے گا، تو اس کے لئے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہوگا۔

(۹) شرعی حکم میں کوئی فرق نہیں ہے

(۱۰) جواز کی صورت سمجھ میں نہیں آتی

(۱۱) پھر بھی جائز نہیں، جب نفس بیمہ ہی حرام ہے تو یہ صورتیں کب اور کیونکر درست ہو سکتی ہیں۔

(۱۲) انشورنس کا معاملہ بایں ہمہ جائز نہیں۔

(الف) جب تک کوئی جائز صورت نہیں سامنے آتی ہے، اور روپے اپنے پاس جمع کرنے خطرناک ہوں تو اس مجبوری میں ڈاکخانہ میں جمع کرنے کی اجازت ہوگی۔ اس کا سود البتہ بلا نیت ثواب صدقہ کر دے، ڈاکخانہ میں چھوڑنا درست نہیں ہے، یہ صورت بیمہ سے اہون ہے۔

اور بہتر صورت یہ ہے جس میں عدم جواز کا کوئی خدشہ ہی نہیں کہ مسلم فنڈ کے نام پر بڑی آبادی میں ایک ادارہ کھولا جائے، جیسا کہ خود ہمارے شہر دیوبند میں قائم ہے اور اس

میں لوگ اپنے روپے جمع کراتے ہیں اور ان کی طرف سے قرض خواہ کو دینے کی اجازت ہوتی ہے اور ادارہ چاندی کے زیورات رہن لے کر بلا سودی قرض دیتا ہے، سالانہ چالیس پچاس ہزار روپے قرض پر باہر رہتے ہیں اور وقت پر وصول ہوتے رہتے ہیں، تفصیل ادارہ سے معلوم کی جاسکتی ہے کہ پتہ یہ ہے مسلم فنڈ مکتبہ دینیہ دیوبند (یوپی)، واللہ اعلم

مندرجہ بالا تحقیق مولانا ظفیر الدین صاحب نے احقر کے مشورہ اور تبادلۂ خیالات کے بعد تحریر فرمائی ہے، مجھ کو اس سے کلیۃً اتفاق ہے۔

فخر الدین غفرلہ، دارالعلوم دیوبند۔ ۲۴/ ۹/ ۸۴

دارالعلوم دیوبند ۲۴؍رمضان المبارک ۱۳۵۴ھ

محمد ظفیر الدین

۲۴؍رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ

●●●

جواب: مولانا مظفر حسین المظاہری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً أما بعد

(۱) بیمہ پالیسی سے متعلق جو تحقیق و تفصیل آپ نے تحریر فرمائی ہے اس سے یہ امر بخوبی واضح ہے کہ بیمہ کمپنی جو زائد رقم اپنے قواعد وضوابط کے تحت پالیسی میں شریک ہونے والے کو دیتی ہے حقیقۃً یہ اس رقم کا معاوضہ ہے جو اس نے بالاقساط کمپنی کو بطور قرض ادا کی ہے کیونکہ یہ صورت نہ بیع میں داخل ہے نہ شرکت میں، نہ مضاربت میں، فقہاء نے جو تعریفات و شرائط بیع و شرکت اور مضاربۃ کی ذکر کیں ہیں وہ اس میں موجود نہیں ہیں البتہ قرض کی تعریف پورے طور پر صادق آتی ہے، علامہ حموی لکھتے ہیں **والقرض کما فی المدارک مال یقضی ببدل مثله من بعد** ، ص۳۹۹ طحطاوی ص۱۰۳ ج۳ میں ہے **مال یقسطه من ماله یعطیه لغیره سمرقندی فقال الشمنی هو ما ثبت فی الذمة باستقراض** ،خود آپ نے بھی سوالنامہ کے ص۳ پر پوری تفصیل ذکر کرنے کے بعد یہی تحریر فرمایا ہے، لہٰذا پالیسی میں شریک ہونے والے کی یہ رقم کمپنی کے ذمہ قرض ہے اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جو حقیقی یا حکمی زیادتی معاوضات میں بدون عوض مشروط ہو ربوا ہے۔

هو فی الشرع عبارة عن فضل مال لا یقابله عوض فی معاوضة مال بمال عالمگیری ص ۱۶۳ جلد ۳، لہٰذا یہ زائد رقم بلاشبہ سود ہے یہی وجہ ہے کہ ائمہ اربعہ بلکہ تمام علماء کا اجماعی طور پر یہی فیصلہ ہے **وقد اجمع المسلمون نقلاً عن النبی صلی الله علیه وسلم ان اشتراط الزیادة فی السلف ربا. عمدة القاری.** (ص۶۸۹ ج۵)

رحمۃ الامۃ میں ہے۔ **واذا افترض رجل من رجل قرضا فهل یجوز ان**

ینتفع بشئی من مال المقترض اولا یجوز ذلک مالم تجری عادة به قبل القرض قال ابوحنیفة ومالک واحمد لا یجوز وان لم یشرطه وقال الشافعی ان کان من غیر شرط جاز والخبر محمول علی ما شرط. (ص۳)

خود روایات میں کل قرض جر منفعۃ فہو ربوا وارد ہے فقہاء نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے کذا فی الدر۔

اس موقعہ پر ممکن ہے کہ یہ شبہ پیدا ہو کہ ربوا کی جو تعریف فقہاء نے بیان کی ہے اس میں معاوضات کی قید مذکور ہے، اور قرض تبرع ہے معاوضات میں داخل نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ قرض ابتداء گو تبرع ہے مگر انتہاء معاوضہ ہے، **لان القرض اعادة ابتداء حتی صح بلفظها معاوضة انتهی . شامی ۴/۲۳۸ وطحطاوی ص۳/۱۰۳**، اور اس سے زیادہ صاف اور واضح تصریح علامہ کاسانیؒ نے فرمائی ہے **ان الاقراض فی الحقیقة مبادلة الشئی بمثله**۔الخ (۵/۲۳۵)۔

رہا یہ امر کہ بیمہ کمپنی اس کو سود نہیں کہتی بلکہ بونس سے تعبیر کرتی ہے یہ نہایت ضعیف اور کمزور امر ہے، اولاً تو اس لئے کہ بیمہ کمپنی کے قواعد وضوابط اس زائد رقم کو جہاں بونس سے تعبیر کیا گیا ہے، وہاں بعض جگہ پر سود کی تصریح بھی کی گئی ہے، دوم یہ امر ثابت شدہ ہے کہ محض نام بدلنے سے کسی شئے کی حقیقت نہیں بدلتی، اور جب تک حقیقت میں کوئی تبدیلی نہ ہو حکم میں بھی کوئی تغیر وتبدیلی نہیں ہوتی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "**یشرب ناس من امتی الخمر باسم یسمونها ایاه.** (ابن ماجہ ص۲۵۰)

مفتی بغداد علامہ آلوسی صاحب حقیقت خمر پر بحث فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولعمری ان اجتماع الفساق فی زماننا علی شرب المسکرات مما عدا الخمر ورغبتهم فیها فوق اجتماعهم علی شرب الخمر ورغبتهم فیه بکثیر وقدوضعوا لها اسماء کالعنبریة والاکسیر ونحوهما ظنا منهم ان هذه الاسماء تخرجها من الحرمة وتبیح شربها للامة وهیهات وهیهات

الامر وراء ما یظنون فانا لله وانا الیه راجعون. (ص۹۷/۴)

علامہ سندی نے حاشیہ ابن ماجہ میں ص۱۷۲ میں حدیث **لعن الله الیهود حرمت علیهم الشحوم** کے تحت لکھا ہے **وانه لا یتغیر حکمه بتغییر هیئة وتبدیل اسمه انتهی** اس سے زیادہ صاف اور واضح تصریح ملاحظہ ہو، **فدل علی ان المنع انما کان لوجود حقیقة الربو وعینه وانه لا تاثیر للصورة المجردة مع قیام الحقیقة فلا تهمل الی قوله فتحت هذه اللفظة ما یشیر الی ان الاعتبار بالحقائق وإنها هی التی علیها المعول وهی محل التحلیل والتحریم الخ اعلام الموقعین.** (ص۳/۱۸۶)

ہمارے فقہاء نے عقود ومعاملات میں یہ کلیہ خاص طور پر تحریر فرمایا ہے:

الاعتبار فی العقود للمقاصد والمعانی لا للالفاظ والمبانی ولذا یجری حکم الرهن فی بیع الوفاء (مجله) والتفصیل فی محله. (ص۸/۱)

ان تمام تصریحات کے پیش نظر یہ امر بخوبی واضح ہے کہ یہ زائد رقم سود میں داخل ہے۔

(۲) کسی شئی میں محض منافع کا وجود جواز وحلت کو مستلزم نہیں، شریعت نے جتنی بھی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں سے کون سی چیز ایسی ہے کہ جس میں فی الجملہ منفعۃ کا وجود نہ ہو، خمر ومیسر میں منافع کا وجود خود قرآن سے ثابت ہے، ومنافع للناس، اور ان کی تفصیل مفسرین نے بیان کی ہے مگر اس کے باوجود حق تعالیٰ نے واثمهما اکبر من نفعهما ارشاد فرمایا ہے کیونکہ شارع کی نگاہ میں ان کے مفاسد وقبائح منافع کے مقابلہ میں اہم تھے، اس لئے ان دونوں کو حرام قرار دیا اور ان کے منافع کو نظر انداز کر دیا گیا، حافظ ابن کثیر اپنی مشہور ومعروف تفسیر میں لکھتے ہیں:

اما المنافع فدنیویة من حیث ان فیها نفع البدن وتهضیم الطعام واخراج الفضلات وتشحیذ بعض الاذهان الی قوله الخ وکذا بیعها

والانتفاع بثمنها وما كان يقمشه بعضهم من الميسر فينفقه على نفسه او عياله ولكن هذه المصالح لا توازى مضرته و مفسدته الراجحة لتعلقها بالعقل والدين. (ص۲۵۵/۱)

امام بیضاوی صاحب لکھتے ہیں:

قل فيهما اثم كبير من حيث انه يودى الى الانتكاب عن المامور وارتكاب المحظور ومنافع للناس من كسب المال والطرب والالتذاذ ومصادقة الفتيان وفى الخمر خصوصاً تشجيع الجبان وتوفير المروة وتقوية الطبيعة واثمهما اكبر اى المفاسد التى تنشأ منهما اعظم من المنافع المتوقعة منهما ولهذا قيل انها المحرمة للخمر لأن المفسدة اذا ترجحت على المصلحة اقتضت تحريم الفعل. بيضاوى (ص۱۰۳ج۱)

لہٰذا یہ امر بخوبی واضح ہوگیا کہ محض منفعت کا وجود حلت وجواز کو مستلزم نہیں بلکہ یہ بھی لازم ہے کہ اس میں ایسے مفاسد وقبائح بھی موجود نہ ہوں جو منافع کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہوں۔

سود کے مفاسد وقبائح پر تفصیلی بحث مفسرین اور اہل اسرار وحکم کے کلام میں بخوبی موجود ہے، حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کا یہ جملہ سود کے کس قدر عظیم مفاسد کی جانب رہنمائی کررہا ہے۔واذا جرى الرسم باستنماء المال بهذا الوجه افضى الى ترک الزراعات والصناعات التى هى اصول المكاسب (ص۲۹۶/۲)۔

یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کا اس کی تحریم پر اتفاق واجماع ہے علامہ ابن نجیم شرح کنز میں لکھتے ہیں وھومحرم بالکتاب والسنۃ والاجماع ص۱۳۷/۶ علامہ نووی صاحب شرح مسلم میں لکھتے ہیں وقد اجمع المسلمون علی تحریم الربوافی الجملۃ ص۲۳/۲

اسی طرح قمار ومیسر کے مفاسد بھی منافع کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں شاہ صاحب لکھتے ہیں،:

اعلم ان الميسر سحت وباطل لانه اختطاف لاموال الناس عنهم معتمد على اتباع جهل و حرص وامنية باطلة وركوب غرر تبعثه هٰذه على الشرط وليس له دخل فى التمدن والتعاون فان سكت المغبون سكت على غيظ وخيبة وان خاصم خاصم ما التزمه بنفسه واقتحم فيه بقصدة ، والغابن يستلذه ويدعوه قليله الى كثيره ولا يدعه حرصه ان يقلع عنه وعما قليل يكون الترة عليه وفى الاعتبار بذلک افساد للاموال ومناقشات طويلة واهمال للارتفاقات المطلوبة واعراض عن التعاون المبنى عليه التمدن۔

لہٰذا محض ان منافع کی بنیاد پر حلت وجواز کا حکم مشکل ہے، نیز یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے اگر کسی امر میں منافع ومفاسد دونوں چیزیں ہیں تو جلب منافع کے مقابلہ میں دفع مضار اہم ہے، الاشباہ والنظائر ص۱۱۲ اور مرأۃ المجلہ ص۱۹ پر یہ ضابطہ مذکور ہے۔

اسی کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی لازم وضروری ہے کہ اسلام چونکہ ایک مکمل مذہب ہے اس لئے اس کے تمام احکام میں یسر وسہولت کا خاص طور پر لحاظ کیا گیا ہے، "يريد الله بكم اليسر ما جعل عليكم فى الدين من حرج، الدين يسر" اس لئے اس نے ضرورت وحاجت کے مواقع میں محرمات شرعیہ سے بقدر ضرورت استفادہ کی گنجائش بھی دی ہے۔

علامہ ابن نجیم اشباہ میں تحریر فرماتے ہیں:

وتتعلق بها قواعد الاولىٰ الضرورات تبيح المحظورات ومن ثم جاز اكل الميتة واساغة اللقمة بالخمر الخ۔ (ص۱۰۸)

مرأۃ المجلہ ص۱۶/۱ پر ہے:

الضرورات تبيح المحظورات يعنى اذا نزل بالانسان احتياج ملجئى كالجوع المميت يباح له أكل الميتة الخ .

فقہاء نے یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ حاجۃ بھی بعض اوقات بمنزلہ ضرورت کے ہوتی ہے **الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت او خاصة** والاشباہ،ص۱۱۵ اورالمرأۃ،ص۲۰/۱۔

لیکن اسی کے ساتھ فقہاء نے ضرورت وحاجت کے مفہوم کو بھی واضح کر دیا ہے تاکہ کوئی شخص سوائے اس مخصوص مواقع کے محرمات سے نفع حاصل کرنے کی جرأت نہ کر سکے،علامہ حموی شرح اشباہ میں نقل فرماتے ہیں:

"هھنا خمس مراتب ضرورة و حاجة ومنفعة وزينة وفضول فالضرورة بلوغه حدا ان لم تتناول الممنوع هلک او قارب وهذا يبيح تناول الحرام والحاجة كالجائع الذى لو لم يجد ما ياكله لم يهلک غير انه يكون فى جهد و مشقة. الخ . (۱)

لہذا ان تصریحات سے یہ امر صاف طور پر ظاہر ہے کہ ضرورۃ وحاجت کے وقت محظورات شرعیہ حد اباحت میں داخل ہوتے ہیں مگر منفعت ، زینت یا فضول ضرورت و حاجت سے علیحدہ ہیں ان میں قطعاً اباحت ثابت نہیں ہوتی اسی کے ساتھ ایک اہم پابندی یہ بھی مقرر کی ہے کہ **ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها**. الاشباہ ص۱۱۵،مرأۃ المجلۃ ص۱۲ پر ہے **الضرورات تقدر بقدرها يعنى ان ما أبيح للضرورة انما تكون اباحته على قدر ازالة الضرورة فلا تباح الزيادة على ذلک بل يجب الاقتصار على ما يبقى من الرمق ويكون سدا من عوز.** لہذا یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ واقعی ضرورت و حاجت کے وقت محظورات شرعیہ بقدر ضرورت مباح ہوتے ہیں ، حاجت وضرورت سے زائد میں اباحت ثابت نہیں ہوتی ،آپ نے بیمہ کے جن مصالح کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے بندہ کے خیال میں اکثر مصالح ضرورت کے درجہ میں داخل نہیں ،البتہ نمبر۴ یقیناً قابل اہتمام وتوجہ ہے کیونکہ جان ومال کی حفاظت فرض ہے جیسا کہ مختلف نصوص کا تقاضہ ہے لہذا اگر جان

(۱) حاشیۃ الحموی علی الأشباہ والنظائر ۱۰۸۔

ومال کی حفاظت کسی دوسرے طریقہ سے ممکن نہ ہو اور تجربہ سے ظن غالب ہوجائے کہ اسی طریقہ سے جان ومال کی حفاظت ممکن ہے تو پھر اس اہم بنیاد پر اس کی گنجائش ہوگی لیکن محض تحصیل مال یا کاروباری ترقیات وغیرہ کے پیش نظر گنجائش نہ ہوگی۔

(۳) مجھے املاک اور ذمہ داریوں کے بیمہ میں قواعد شرع کے تحت کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا ، املاک کے بیمہ میں گو کمپنی مالک کو مخصوص صورتوں میں جو معاوضہ دیتی ہے صورۃ تو وہ تلف شدہ مال کا عوض ہے مگر حقیقت کے لحاظ سے اس رقم کا عوض ہے جو طالب نے کمپنی کو ادا کی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ تلف شدہ مال سے کمپنی کو کوئی نفع حاصل نہیں ہوا البتہ اس جمع شدہ رقم سے یقیناً فائدہ حاصل ہوا ہے لہذا یہ بھی زیادتی علی القرض ہے جو سود میں داخل ہے اور جو اس کا حکم ہے وہ ہی ان دونوں کا بھی ہے۔

(۴) فقہاء نے قمار کی حقیقت تملیک المال علی سبیل الخطر تحریر فرمائی ہے:

القمار هو المراهنة كما فى القاموس وفيه المراهنة والرهان المخاطرة وحاصله انه تمليک على سبيل المخاطرة شامى ص ۳۲۴/۴ . وفيه لان القمار من القمر الذى يزداد تارة و ينقص اخرى و سمى القمار قمار لان كل واحد من المقامرين يجوز ان يذهب ماله الى صاحبه ويجوز ان يستفيد مال صاحبه وهو حرام بالنص. (ص۲۶۷/۵)

فقہاء نے وہ تمام معاملات وعقود کو بھی قمار میں داخل قرار دیئے ہیں جن میں تعلیق التملیک علی الخطر متیقن ہو، چنانچہ بیع ملامسۃ ،منابذہ، بیع القاء الحجر وغیرہ کے عدم جواز کی وجہ علامہ علاء الدین حصکفیؒ نے وجود قمار ہی ذکر فرمائی ہے:

وهى من بيوع اهل الجاهلية فنهى عنها كلها لوجود القمار عينى وفى الشامى. (ص۱۵۱/۴)

قوله لوجود القمار اى بسبب تعليق التمليک باحد هذه الافعال. انتهى ، ہمارے فقہاء نے باب الھبہ میں رقبی کے عدم جواز کی وجہ تعلیق بالخطر ہی بیان فرمائی

ہے کمافی الدراور حجۃ اللہ البالغہ ص۹۲ ۷/۴ میں ہے **واعلم ان من البیوع ما یجری فیہ معنی المیسر و کان اھل الجاھلیۃ یتعاملون بھا فیما بینھم فنھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم منھا المزابنۃ والمحاقلۃ.** الخ۔ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ ان میں قمار بھی موجود ہے۔(۱)

(۵) اس کا جواب ماقبل سے ظاہر ہے۔

(۶) جن علماء کے نزدیک ان کمپنیوں سے یہ معاملہ کرنا جائز نہیں ہے، ان کے قول کی بناء پر اخذ ربوا کا گناہ نہ ہوگا، (مگر وہاں چھوڑنا ہرگز ہرگز مناسب نہیں ۱۲) مگر کمپنی چونکہ اس روپیہ سے سود پر قرض بھی دیتی ہے اس لئے یہ اعانت علی المعصیۃ ہونے کی بناء پر معصیت ہوگا، ﴿**ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان**﴾ الآیۃ (۲) اور حموی نے تو بعض فقہاء سے اس کا کبیرہ ہونا نقل کیا ہے ص۱۱۴ اور جن علماء کے نزدیک ان کمپنیوں سے معاملہ کرنے کی گنجائش ہے ان کے قول کی بنا پر سود بھی لینے کی گنجائش ہوگی اور اس عقد کی بھی کما سیجئ تفصیلہ۔

(۷) سوال ۲ کے جواب سے یہ امر واضح ہوگیا ہے کہ محض نام بدلنے سے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور حقائق و مقاصد پر ہی احکام کا مدار ہوتا ہے اس لئے اس تفصیل کے پیش نظر یہ ناجائز ہی ہے، یہ خوشنما تعبیر محض عوام اور سیدھے سادھے مسلمانوں کو ان مہلک اور تباہ کن چیزوں میں مبتلا کرنے کے لئے اختیار کی جاتی ہیں۔

(۸) جمہور علماء کے نزدیک عموم نصوص کی بنا پر سود لینا دینا مطلق حرام ہے، البتہ طرفین کے نزدیک دارالحرب میں مسلم اور حربی کے درمیان ربوا نہیں ہے چنانچہ فقہاء نے عام طور پر اس کی تصریح فرمائی ہے۔**ولا بین المسلم والحربی ثمہ، کنز فی البحر** ص۱۴۷/۶ **ولا ربا بینھما فی دارالحرب عندھما خلافا لابی یوسف وفی البنایۃ وکذا اذا باع خمرا او خنزیرا أو میتۃ أوقامرھم واخذ المال کل ذلک یحل لہ**، اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ طرفین کے نزدیک دارالحرب میں

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ ۲/۱۶۷۔ (۲) سورہ مائدہ:۲۔

حربی سے مسلمان کو قمار وعقود فاسدہ وباطلہ کی بھی گنجائش ہے (بشرط عدم الغدر ۱۲) طرفین کے اس قول پر اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ حکم اخذ واعطاء دونوں میں ہے یا صرف اخذ میں بعض علماء نے دونوں کی اجازت دی ہے، فتاویٰ عزیزیہ ۴۳/۱، مگر بعض فقہاء نے صرف اخذ کی اجازت دی ہے۔ بحر ص۱۴۷/۶ میں ہے:

فاذا اخذ برضاھم اخذ مالا مباحا بلا غدر فیملک بحکم الاباحۃ السابقۃ الا انہ لا یخفی انہ انما اقتفی حل مباشرۃ العقد اذا کان الزیادۃ ینالھا المسلم والربا اعم من ذلک اذ یشمل ما اذا کان الدرھمان من جھۃ المسلم او من جھۃ الکافر وجواب المسئلۃ بالحل عام فی الوجھین کذا فی فتح القدیر فی المنحۃ قولہ کذا فی فتح القدیر تتمہ عبارۃ الفتح وکذا القمار قد یفضی الی أن یکون مال الخطر الکافر بان یکون الغلب لہ فالظاھر ان الاباحۃ یفید نیل المسلم الزیادۃ وقد لزم الاصحاب فی الدرس ان مراد ھم من حل الربا والقمار ما اذا حصلت الزیادۃ للمسلم نظراً إلی العلۃ وإن کان اطلاق الجواب خلافہ، ومثلہ فی الشامی والدرر. (۱)

پھر یہ امر بھی مختلف فیہ ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ اسماعیل صاحب، حضرت گنگوہی صاحب وغیرہ کے دلائل وتحریرات کے مطابق دارالحرب ہے، اور مولانا عبدالحئی صاحب وغیرہ کی تصریح کے مطابق دارالاسلام ہے اور جن اسباب کی بنا پر پہلے اختلاف تھا وہ اب بھی موجود ہیں، **الافی بعض الامصار والقری**، لہٰذا جمہور علماء کے قول کی بنا پر تو اجتناب واحتراز ہی لازم ہے لیکن حاجۃ وضرورۃ کے موقعہ پر طرفین کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے چونکہ **یرید اللہ بکم الیسر، الدین یسر الحرج مدفوع، الامر اذا ضاق اتسع** کے علاوہ فقہاء نے مواضع ضرورۃ میں قول ضعیف پر فتویٰ دینے کی گنجائش بھی تحریر فرمائی ہے، **قلت لکن ھذا فی غیر مواضع الضرورۃ فقد ذکر فی البحر فی بحث ألوان الدماء اقوالا ضعیفۃ ثم قال فی**

(۱) درمختار ۵/۱۸۶۔

المعراج عن فخر الأئمة لو أفتیٰ مفتی بشیء من هذه الأقوال فی مواضع الضرورة طلبا للتیسیر کان حسناً. (۱) مگر اس پر غور وفکر کرلیا جائے کہ عام طور سے اس قول پر فتویٰ دیتے ہیں تو تمام شرائط وحدود کی رعایت مشکل معلوم ہوتی ہے، نیز اس گنجائش سے باب ربوا کا فتح بھی ممکن ہے اس لئے عام طور پر جواز کا فتویٰ دینے سے احتراز انسب ہے کیونکہ علاوہ مفاسد مذکورہ کے اکثر علماء کے مسلک کے خلاف ہے، نیز خود دارالحرب ہونا بھی مختلف فیہ ہے، ہاں اگر کوئی شخص اپنے مخصوص حالات میں اس قسم کی کمپنیوں سے استفادہ کر لے تو زیادہ تشدید وتنگی بھی نہ کی جائے۔ واللہ اعلم

اب یہ بحث کہ طرفین کے قول کی بنا پر حربی سے اخذ ربوا کا حکم صرف مسلم مستامن کے لئے ہے یا جو مسلمان دارالحرب ہی کا باشندہ ہے اس کے لئے بھی، ظاہر اطلاق فقہاء سے عموم معلوم ہوتا ہے مگر حضرت تھانویؒ نے **رافع الضنک عن منافع البنک** میں طرفین کے قول پر جواز کی شرط بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

(نمبر۴) معاملہ کرنے والا وہ مسلم ہو جو دارالاسلام سے دارالحرب میں امن لے کر آیا ہے یا وہ مسلم ہو جو دارالحرب ہی میں اسلام لایا ہو وہ مسلم اصلی نہ ہو جو خود دارالحرب میں رہتا ہو اس قید رابع کی تصریح کہیں نظر سے نہیں گذری مگر اس قاعدہ کی تصریح ہے کہ روایات فقہیہ کے مفاہیم حجت ہیں الخ

مگر بحر کی تصریحات عام طور سے اس قید سے ساکت ہیں گو علاء الدین حصکفی نے یہ قید ضرور ذکر کی ہے۔

(۹) حربیوں کی نجی کمپنیاں اور حکومت غیر مسلمہ اس حکم میں برابر ہیں۔

(۱۰) زیر بحث معاملہ میں حکومت کا عطیہ قرار دے کر بھی حدود ربوا سے خارج نہ ہوگا، چونکہ طالب قسطوں میں جو روپیہ جمع کرے گا اس پر یہ زائد رقم بنام عطیہ دی جائے گی لہٰذا حقیقۃ یہ قرض ہے اور حکومت اس قرض پر زیادتی دے رہی ہے جو کل قرض جر منفعۃ فہو ربوا میں داخل ہے پھر عطیہ تملیک عین بلاعوض ہے، مسئولہ صورت میں یہ تعریف بھی اس پر

(۱) شامی ۱/۸۰۔

صادق نہیں آتی ہاں طرفین کے قول کی بنا پر گنجائش پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔

(۱۱) جن علماء کے نزدیک دارالحرب میں حربی سے سود لینا دینا جائز نہیں ہے، ان کے نزدیک اولاً تو اس میں شرکت ہی جائز نہیں لیکن اگر حاجۃ شدیدہ اور ضرورت کے تحت کسی کے لئے کوئی گنجائش ثابت ہو جائے تو پھر اس زائد رقم کو اپنے استعمال میں نہ لایا جائے۔

(الف) نیز مال حرام کا اصل حکم یہ ہے اس کو اصل مالک کی طرف رد کیا جائے، اس لئے اگر اس رقم کو لے کر ٹیکس وغیرہ میں دے دے تو گنجائش ہے اس میں ردالی المالک محقق ہے، نیز ناجائز ٹیکسوں سے گویا کہ حفاظت بھی، حضرت گنگوہی کے فتاویٰ ص ۴۳۱ میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔

(ب وج) یہ جائز نہ ہوگا چونکہ ردالی المالک جب تک ممکن ہے اس کو اختیار کیا جائے مذکورہ شکل میں ظاہر یہ متحقق نہیں ہو، **والحاصل انه ان علم ارباب الاموال وجب رده علیهم والا فان علم عین الحرام لا یحل له ویتصدق به بنیة صاحبه** . الخ شامی شرح سیر کبیر ص ۳/۳ میں ہے **وما حصل بسبب خبیث فالسبیل رده.** الخ البتہ طرفین کے قول کی بنا پر الف ب وج خود استعمال کرنا اور ہر موقعہ پر خرچ کرنا جائز ہے۔

(۱۳) جمہور علماء کے قول کی بنا پر تو جائز نہیں یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص اس نیت سے چوری یا رہزنی کرتا ہے کہ غرباء کی اعانت وہمدردی کروں گا ظاہر ہے کہ عقلاً، شرعاً عرفاً یہ نیت وارادہ باطل ومذموم ہے، طرفین کا قول سابق میں تفصیل کے ساتھ تحریر کیا جا چکا ہے۔

(الف ب) آپ حضرات ہی کوئی ترمیم یا بدل تجویز فرمائیں تو پھر غور کیا جائے کہ موجودہ شکل کی تفصیل احقر نے لکھ دی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ مظفر حسین المظاہری عفی عنہ

مظاہر العلوم سہارنپور

●●●

جواب: مولانا عبیداللہ مبارکپوری

(۱) سوالنامے میں انشورنس کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے اس میں بیمہ کمپنی جو رقم بطور سود دیتی ہے جس کا نام وہ اپنی اصطلاح میں ''منافع'' رکھتی ہے وہ بلاشبہ شریعت اسلامی کا اصطلاحی ''ربوا'' ہے کتب فقہ میں ''ربوا'' کی یہ تعریف کی گئی ہے:

"الربوا هو الفضل المستحق لا حد المتعاقدين فى المعاوضة الخالى عن عوض شرط فيه" (هداية ص ۶۱ ج۳).

"الربوا فى الشرع عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض فى معاوضة مال بمال" (حاشية هداية ص ۶۱ ج۳).

"وفى الشريعة الربا هو الفضل الخالى عن العوض المشروط فى البيع" (المبسوط للسرخسى ص ۱۰۹ ج۱۲)

تعریف میں ''بیع'' کی قید احترازی نہیں ہے۔ مقصود صرف ''معاوضہ مال بالمال'' ہے۔ اور بیمہ میں بیمہ دار، بیمہ کمپنی کو ایک مقررہ رقم قسط وار بطور قرض کے دیتا ہے، اور اس کے عوض میں کمپنی سے اسی قدر یا اس سے زیادہ رقم وصول کرتا ہے۔ اس لئے یہاں ''معاوضہ مال بالمال'' بلاشبہ موجود ہے۔ اور ''ربا الفضل'' کے ساتھ ''ربا النسیئہ'' بھی متحقق ہے۔ اور شرعاً ''ربوا'' کی یہ دونوں ہی قسمیں حرام وممنوع ہیں۔ واضح رہے کہ نام بدل دینے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ پس کمپنی والے یا کوئی دوسرا اس زائد رقم کا جسے کمپنی بیمہ دار کو

ادا کرتی ہے ''منافع'' سے بھی زیادہ پرکشش اور حسین بظاہر بے ضرر نام رکھ دے تب بھی وہ شریعت کا اصطلاحی ''ربوا'' ہی رہے گا۔ اور ''ربوا'' شرعی ہونے کی وجہ سے حرام ہوگا۔ اس معاملہ میں بینکوں کا ''ربوا'' اور بیمہ کمپنی دونوں یکساں ہیں۔ دونوں کے حکم میں شرعاً کوئی فرق نہیں ہے۔

(۲) ہاں جب تک بیمہ کی کوئی ایسی صورت اور طریقہ نہ نکلے جو ''ربوا'' ''قمار'' ''غرر'' وغیرہ قبائح سے خالی اور پاک ہو اضطرار شرعی کی حالت میں جس کی وضاحت آگے آرہی ہے بیمہ کے معاملہ کے جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

یہ معلوم ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم فرقہ پرست جماعتیں مسلم اقلیت کی بیخ کنی اور اس کی نسل کشی اور جائداد واملاک کی تباہی وبربادی پر تلی ہوئی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ حکومت خواہ مرکزی ہو یا ریاستی عملاً اس معاملہ میں غفلت وبے پروائی برت رہی ہے۔ اور انتظامیہ جس کے ذمہ تمام شہریوں (باشندگان ہند) کے جان ومال عزت وآبرو کی حفاظت وصیانت ضروری ہے اور جس کا منصبی فرض، امن وامان کا قائم رکھنا اور فتنہ وفساد اور ظلم وزیادتی کے اسباب کا ختم کرنا ہے، ہر ایسے موقع ومقام پر صرف یہی نہیں کہ اپنے فرض کی ادائیگی میں غفلت اور پہلوتہی سے کام لیتی ہے، بلکہ فسادیوں اور لٹیروں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ بلکہ اس کے ذمہ دار افراد خود بھی لوٹ مار اور قتل وخونریزی میں شریک ہوجاتے ہیں۔ پھر اس یکطرفہ فساد کے فرو ہونے کے بعد بچے کھچے مسلمانوں کی کوئی دادرسی نہیں ہوتی اور نہ سرکاری طور پر ان کے بسانے اور آباد کرنے کا حسب خواہ انتظام ہوتا ہے۔ اقتصادی حیثیت سے یہ بچے کھچے مسلمان کلی طور سے تباہ وبرباد ہوجاتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہے کہ ایسے فساد زدہ مقامات کے مسلمان مقامی طور پر تعداد اور قوت کے لحاظ سے اتنے کمزور وبے بس ہوتے ہیں کہ بلوائیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اور عدوی غیر معمولی تفاوت کی وجہ سے اس حال میں نہیں ہوتے کہ شرعاً خود ان کے ذمہ اپنی مدافعت اور بلوائیوں کا مقابلہ کرنا متعین ہو۔ اور ان کی جان واملاک اور عزت وآبرو کے محفوظ رہنے

کی کوئی جائز اور مباح قابل عمل صورت نہیں رہتی تو جس مقام کے مسلمانوں کی یہ پوزیشن ہو، یعنی ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے محفوظ رہنے کی کوئی جائز صورت نظر نہ آ رہی ہو وہ ہمارے نزدیک شرعاً مضطر کے حکم میں ہیں محض ایسے مقام کے مسلمانوں کے لئے حفظ ما تقدم کے طور پر صرف اس نیت سے کہ آئندہ ان کی جان و مال عزت و آبرو محفوظ رہ جائے اپنی زندگیوں اور املاک کا بیمہ کرانا جائز ہوسکتا ہے۔ مگر اپنی جمع کردہ اقساط سے زائد جس قدر رقم بھی کمپنی سے وصول کریں اس کو اپنی ذات پر اپنے عزیز و اقارب پر یا کسی بھی غیر مضطر مسلمان پر بالواسطہ خرچ نہ کریں، بلکہ اپنے یا دوسرے مسلمان کے ذمہ عائد کردہ ٹیکسوں اور چندوں میں جو ظالمانہ ہوں خود حکومت کو دے دیں۔

اس خاص حالت وصورت اور مصلحت کے علاوہ سوالنامے میں ذکر کئے ہوئے مصالح میں سے کوئی بھی مصلحت ایسی نہیں ہے کہ جس کے پیش نظر اور اس کی رعایت سے سودی کاروبار کرنے یا دولت کمانے کے لئے حرام وسائل و ذرائع کسب اختیار کرنے کی گنجائش اور اجازت شریعت میں موجود ہو، نیز بیمہ کے مذکورہ مصالح کے ساتھ اس میں غیر معمولی مفاسد اور مضار بھی ہیں اور یہ معلوم ہے کہ دفع مفسدہ و مضرت جلب مصلحت پر مقدم ہے۔

سرمایہ محفوظ رکھنے یا اس میں اضافہ کرنے کے لئے یا پسماندگان کی امداد و اعانت یا ناگہانی حادثہ اور نقصان کی تلافی کے لئے ربوی کاروبار کرنے یا کوئی بھی حرام کاروبار چلانے کی یا اس میں تعاون کرنے کی شریعت میں اجازت نہیں ملتی۔

(۳) بیمہ کی تینوں مذکورہ قسموں کے درمیان حکماً کوئی فرق نہیں ہے، تینوں ہی میں ''ربوا'' ''قمار'' ''غرر'' یکساں پایا جاتا ہے اس لئے شرعاً تینوں کا حکم ایک ہی ہوگا۔ بعض علماء درج ذیل معاملات کی روشنی میں املاک اور ذمہ داریوں کے بیمہ کے جواز کے قائل ہیں۔

(الف) کوئی شخص کسی کے یہاں اجرت پر اپنی چیز امانت رکھے اور وہ چیز مستودع کے یہاں تلف ہوجائے تو مستودع اس کا ضامن ہوتا ہے۔ اور اس کو مثل یا قیمت

مستودع کو ادا کرنی پڑتی ہے۔

(ب) راستہ کے خطرات کی ضمانت مثلاً کوئی کسی سے کہے ''**اسلک ھذا الطریق فانہ اٰمن و ان اخذ فیہ مالک فانا ضامن**'' اب اگر اس راستہ میں جانے والے کے مال کا نقصان ہوجائے تو معاملہ اور معاہدہ کی رو سے عہد کرنے والا مال کا ضامن ہونے کی وجہ سے ادائیگی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور اسے تلف شدہ مال کا مثل یا قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔

(ج) عقد موالاۃ کہ اس میں ایک شخص دوسرے کی جنایت سے عائد شدہ مالی تاوان کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے بصورت وارث شرعی (قرابتدار) نہ ہونے کے اس دوسرے شخص کی جائداد کا وارث ہوتا ہے۔

(د) بعض خاص صورتوں میں مالی وعدہ کے ایفاء کا لزوم و وجوب۔

(ہ) عقد جعالہ جس میں ایک شخص دوسرے کے ایک متوقع اور غیر یقینی فائدہ کے حصول کے لئے معین اجرت پر ایک معین عمل اپنے ذمہ لازم کرلیتا ہے۔

(و) عقد حراسۃ جس میں حفاظت کی غرض و غایت کی خاطر ایک شخص سے اپنی کسی چیز کی حراست و حفاظت پر معینہ اجرت کے عوض معاملہ کرلیتا ہے۔

(ز) جنایات خطا میں عصبہ کے ذمہ دیۃ کے عائد ہونے کا مسئلہ۔

ہمارے نزدیک ان مسائل سے املاک و ذمہ داری کے بیمہ کے جواز پر استدلال واستیناس بچند وجوہ مخدوش ہے۔

اولا— اس لئے کہ ان میں نظام عواقل کے علاوہ بقیہ مسائل فقہاء امت کے درمیان مختلف فیہ ہیں اور بعض تو فقہ حنفی کے بھی خلاف ہیں۔

ثانیا— اس لئے کہ بیمہ اور ان مسائل کے درمیان کوئی علت جامعہ مشترکہ جو حکم کا مرکزی سبب اور مناط ہو موجود نہیں ہے، اور مقیس اور مقیس علیہ کے درمیان بون بعید ہے۔

ثالثا— اس لئے کہ اگر ان خدشات سے قطع نظر کرلیا جائے تو بیمہ کے جملہ اقسام

میں کھلے ہوئے ربا الفضل والنسیئہ کے پائے جانے سے یہ جملہ نظائر بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔اور ان سے مروجہ بیمہ کے جواز پر استدلال صحیح نہیں ہوسکتا۔

(۴) بیمہ کا معاملہ اگر غور کیا جائے تو ایک طرح کا ''قمار'' ہے۔اور اگر بالفرض یہ معاملہ حقیقتاً قمار نہ ہو تو ''قمار'' کے مشابہ ضرور ہے ''قمار'' کی روح اور اس کا بڑا عنصر مخاطرہ (**ارتکاب مافیہ خطر بالنفس او المال**) اور دوران بین الغنم والغرم (یعنی فائدہ اور خسارہ وتاوان دونوں کا یکساں احتمال) ہے۔اور یہ چیز بیمہ میں صاف طور پر پائی جاتی ہے بیمہ دار معاملہ کر لینے کے بعد پہلی قسط ادا کرنے سے پہلے ہی مر جائے یا اس کی بیمہ شدہ جائداد تلف ہو جائے تو اس کو یا اس کے قانونی ورثہ کو بیمہ کی پوری مقررہ رقم مع شئ زائد کے ملتی ہے۔اس طرح اس کو سراسر فائدہ ہی فائدہ رہتا ہے۔اور کمپنی کو پورا نقصان وخسارہ۔اور اگر بیمہ دار کئی قسطیں ادا کرنے کے بعد کسی وجہ سے بقیہ اقساط کی ادئیگی بند کردے تو اس کی ادا کی ہوئی کل رقم سوخت ہو جاتی ہے۔اس صورت میں بیمہ دار کا سراسر نقصان اور کمپنی کا پورا فائدہ ہوتا ہے۔دونوں صورتوں میں ''مخاطرہ'' اور ''دوران بین الغنم والغرم'' کا تحقق ظاہر ہے۔اور اکل مال بالباطل بھی موجود ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمپنی کو معمولی تاوان برداشت کرنا ہوتا ہے اور کبھی وہ ایک ہی بیمہ دار کے ذریعہ یعنی اس کی جمع کردہ رقم سے ہزار ہا روپئے کما لیتی ہے اس طرح بیمہ دار اور بیمہ کمپنی کو جو کچھ لینا اور دینا ہوتا ہے ان کے درمیان کوئی تناسب نہیں ہوتا۔اور یہ سب کچھ ''قمار'' میں بھی ہوتا ہے۔

(۵) بیمہ کے معاملہ میں ''غرر'' بھی ہے غرر بھی وہ جو قلیل ویسیر اور معمولی نہیں جو شرعا معفوعنہ ہوتا ہے۔بلکہ کثیر عظیم جو غیر معفوعنہ ہے۔

''غرر'' منہی عنہ کی یہ تعریف کی گئی ہے: **"ما شک فی حصول احد عوضیہ أو المقصود منہ غالبا (۱) وقیل ھو ما انطوت عنا عاقبتُهُ وقیل ما کان**

(۱) شرح حدود ابن عرفہ ۳۵۰۔

لہ ظاھر یغر المشتری وباطن مجھول یعرفہ البائع وقیل ما لہ ظاھر یؤثرہ وباطن یکرھہ". (۱)

عوضین یا ان میں سے کوئی ایک مجہول الصفۃ ہو یا مجہول الاجل یا غیر مقدور التسلیم ہو یا غیر موجود ہو یا غیر معلوم المقدار ہو یہ تمام صورتیں ''غرر'' کی ہیں اور فساد معاملہ کے لئے کافی۔بیمہ میں اگر چہ بیمہ کی مجموعی رقم کی مقدار متعین ہوتی ہے مگر بیمہ دار اور کمپنی میں سے کسی کو نہیں معلوم کہ بیمہ دار کب تک زندہ رہے گا اور اس کی بیمہ شدہ جائداد یا جانور کب تک محفوظ وزندہ رہے گا اور وہ بیمہ کی کتنی قسطیں ادا کر سکے گا۔اور کمپنی کو واقع میں کتنی قسطیں ملیں گی۔اور اسے کب اور کتنی رقم بیمہ دار کو دینی پڑے گی۔اس طرح عوضین عند العقد باوجود بیمہ کی رقم کے متعین ہونے کے مجہول المقدار والاجل ہوتے ہیں۔بلکہ غیر ثابت وغیر متحقق الوجود ہوتے ہیں۔لہذا بیمہ میں غرر کثیر غیر معفوعنہ کا تحقق ظاہر ہے۔بیمہ میں قمار وغرر ہوتے ہوئے اس کی گنجائش جس حال میں نکل سکتی ہے وہ (۲) میں عرض کر دی گئی ہے۔

تنبیہ

بیمہ پالیسی میں ایک اور شرعی قباحت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بیمہ پالیسی خریدنے والا مقررہ میعاد کے اندر مر جائے یا اس کے بعد مرے بہر صورت کمپنی کی طرف سے ملنے والی رقم کی حیثیت شرعا میت کی میراث اور ترکے کی ہے جسے حسب فرائض شرعی وارثوں میں تقسیم ہونا چاہئے۔مگر یہ رقم ترکے کی حیثیت سے تقسیم نہیں کی جاتی۔بلکہ اس شخص یا اشخاص کو مل جاتی ہے جن کے لئے بیمہ دار نے وصیت کی ہو۔حالانکہ وارث کے حق میں شرعا وصیت ہی نہیں کی جاسکتی۔**لا وصیة لوارث** ونیز بجائے شرعی وارثوں کے حسب وصیت صرف قانونی وارثوں کو ملتی ہے۔ونیز ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ بیمہ کی کل رقم اس کے ثلث مال سے زائد ہو اور ثلث سے زائد کی وصیت کرنا شرعا درست نہیں ہے **الا ان یشاء الورثة**۔

(۶) بیمہ دار بیمہ کے ہر سہ اقسام میں کسی میں سود لینے سے بالکل اجتناب

(۱) الشیخ الجواہری ۲۲/ ۳۸۷۔

واحتراز کرے اور صرف اپنی اصل رقم کی واپسی چاہتا ہو تب بھی یہ معاملہ کرنا جائز نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ کمپنی بیمہ داروں سے جو رقم علی الاقساط وصول کرتی ہے اس کے بڑے حصے کو سودی کاروبار میں لگا دیتی ہے۔ اور دوسرے لوگوں کو بطور قرض دے کر اعلی شرح پر سود حاصل کرتی ہے اس ناجائز کاروبار میں تمام بیمہ دار آپ سے آپ حصہ دار اور شریک ہوجاتے ہیں جو کھلا ہوا تعاون علی الاثم والعدوان ہے۔

(۷) کمپنی بیمہ دار کو جو رقم بطور سود ادا کرتی ہے اسے ''ربوا'' کے بجائے اس کی طرف سے امداد واعانت اور تبرع واحسان نہیں قرار دیا جاسکتا، چاہے اس کے ایجنٹ اس کا مقصد امداد ہی کیوں نہ ظاہر کریں۔

اولا— اس لئے کہ خود کمپنی اس کو امداد واعانت اور احسان وتبرع سمجھ کر نہیں بلکہ بیمہ دار کا اپنے اوپر لازمی وواجبی حق سمجھ کر دیتی ہے۔ محض کسی کے فرض کر لینے سے ضروری چیز غیر ضروری اور غیر ضروری چیز ضروری ہوجایا کرے تو ضروری اور غیر ضروری کا ضابطہ اور فرق ختم ہوجائے گا۔

ثانیا— اس لئے کہ تبرع واحسان اور حسن سلوک مشروط نہیں ہوا کرتا اور کمپنی اپنے قواعد وضوابط کے مطابق اس سودی رقم کے دینے کی شرط کر لیتی ہے۔ اور اس شرط کے مطابق ادائیگی کی قانونا پابند ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی بیمہ دار اس کو کسی وجہ سے نہ لے اور چھوڑ دے۔

ثالثا— اس لئے کہ سود شرعا حرام ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ دینے والا ایسی چیز دے رہا ہے جو شرعا حرام ہے اس کی طرف سے اسے اس کا تبرع واحسان یا امداد واعانت سمجھ کر قبول کرنا عقلا، عرفا، شرعا ہر طرح مذموم اور قبیح ہے اور ہمارے تبرع واحسان سمجھ لینے سے حرام چیز حلال نہیں ہوجائے گی۔

رابعا— اس لئے کہ پھر اس بارے میں بیمہ کے معاملہ کی خصوصیت نہیں رہے گی۔ ہر سودی معاملہ اور ربوی کاروبار میں سود کو اس کے دینے والے کا تبرع واحسان اور

اس کی طرف سے امداد واعانت سمجھ کر قبول کرنے اور سود لینے کا دروازہ کھل جائے گا۔

خامسا— اس لئے کہ پھر ڈاکو، چور، غاصب، خائن وغیرہ اگر ڈاکہ یا چوری اور غصب کے مال میں سے کسی کو کچھ دیں تو اس کو ان کی طرف سے امداد واعانت اور تبرع واحسان سمجھ کر لے لینے میں مضائقہ اور حرج نہیں ہونا چاہئے۔

سادسا— اس لئے کہ اس کے بعد ڈاکوؤں اور چوروں کو ڈاکہ ڈالنے اور چوری کرنے کا ایک ''معقول'' بہانہ مل جائے گا۔ وہ کہہ سکیں گے کہ چوری اور ڈاکہ سے ہمارا مقصد غریبوں کی امداد واعانت اور حسن سلوک ہے۔

سابعا— اس لئے کہ پھر بینک کے سود کو بھی بینک کا تبرع واحسان سمجھ کر اس کے جواز کا قائل ہونا پڑے گا۔ پھر یہ تصور اور نیت ختم ہوکر مطلقا اس کے لین دین کا چلن ہوجائے گا۔

(۸) کوئی مسلمان دارالحرب کا باشندہ ہو۔ اور کمپنی بھی حربیوں ہی کی ہو تب بھی یہ معاملہ مسلمان کے لئے ناجائز ہی رہے گا۔ ایک مسلمان کے لئے خواہ وہ دارالاسلام کا باشندہ ہو اور دارالحرب میں مستامن ومعاہد کی حیثیت سے ہو یا دارالحرب ہی کا باشندہ ہو بہر حال اس کا جس طرح دارالاسلام میں کسی مسلمان سے سودی معاملہ کرنا اور سود لینا اور دینا جائز نہیں ہے اسی طرح حربی سے بھی خواہ وہ دارالحرب میں ہو یا دارالاسلام میں مستامن کی حیثیت سے ہو بہر صورت اس کا اس حربی سے ربوی معاملہ کرنا اور سود لینا حرام ہے۔ کتاب اللہ اور سنت نے اس بارے میں دارالحرب اور دارالاسلام یا حربی اور غیر حربی کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے بلکہ ''ربوا'' کو مطلقا حرام کر دیا ہے اور ایک مسلمان کے لئے ربوی معاملہ کو خواہ وہ کہیں بھی ہوا اور کسی سے بھی یہ معاملہ کرنا چاہے بہر حال حرام قرار دیا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی حاشیۂ درمختار میں ص ۲۴۹ ج ۳ میں سوکرہ یا انشورنس کے معاملہ میں جو یہ تفصیل اور فرق کیا ہے کہ اگر سوکرہ کا معاملہ حربی مستامن سے دارالاسلام میں ہو تو ناجائز ہے پس ناگہانی آفت سے بیمہ شدہ مال تلف ہوجانے کی صورت میں اس

مستامن حربی سے بیمہ دار مسلمان کے لئے اپنے تلف شدہ مال کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہوگا۔ **"لانہ لا یحل لمسلم ان یتعاقد فی دارنا مع المستامن الا ما یحل من العقود مع المسلمین ولا یجوز ان یوخذ منہ شئ لا یلزمہ شرعا "**(۱) اور جو مسلمان (دارالاسلام کا باشندہ ہو یا دارالحرب کا) اگر وہ سوکرہ (انشورنس) کا معاملہ حربی سے دارالحرب میں کرے تو یہ معاملہ جائز اور درست ہوگا۔ اور اس صورت میں اس مسلمان بیمہ دار کے لئے اس حربی سے اپنے تلف شدہ مال کا معاوضہ لینا جائز ہوگا۔ **"لانہ اخذ مال حربی برضاہ دون غدر ولا خیانۃ ولیس بعقد فاسد معقود فی دارالاسلام حتی یکون خاضعا لاحکامنا"** (۲) اس فرق وتفصیل پر کتاب اللہ اور سنت سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس فرق کی اساس وبنیاد صرف یہ خیال ہے کہ خاص دارالحرب میں رہنے والے حربیوں کے اموال غیر معصوم ہیں۔ اور جب وہ غیر معصوم ہیں تو وہاں سود کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس بیان کردہ وجہ فرق سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت ''ربوا'' کے تحقق کے لئے مال کا معصوم ہونا شرط ہے، اور جب یہ شرط حربی کے اموال میں متحقق اور موجود نہیں ہے تو وہاں حقیقت ربوا بھی متحقق نہیں ہوگی۔ لیکن یہ دعویٰ اور فرق کی یہ توجیہ وتعلیل کسی نص شرعی سے ثابت نہیں۔ قرآن کریم اور احادیث نبویہ نے ''ربوا'' کے تحقق کے لئے اموال کے معصوم ہونے کی شرط نہیں لگائی ہے۔ بلکہ اموال غیر معصومہ میں جو ربوی کاروبار ہوتا تھا اور جسے خالص حربی کیا کرتے تھے اس کو بھی ''ربوا'' کہا ہے اور اس ''ربوا'' کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ آیت ﴿**الذین یاکلون الربوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس ذلک بانہم قالوا انما البیع مثل الربوا واحل اللہ البیع وحرم الربوا**﴾ **الخ**''(۳) غیر مسلموں ہی کی تردید میں نازل ہوئی ہے جو ''بیع وربوا'' کو یکساں سمجھ کر ربوی کاروبار اور سودی لین دین کیا کرتے تھے۔ اس آیت نے غیر مسلموں کے ربوی معاملہ کو جو وہ اپنے اموال غیر معصومہ میں کرتے

(۱) ردالمحتار ۴/۳۴۹۔ (۲) ایضاً۔ (۳) بقرہ:۲۷۵۔

تھے ''ربوا'' کہا ہے۔ اور اس کا کاروبار کرنے والوں کو عذاب آخرت کی دھمکی دی ہے۔ معلوم ہوا کہ ''ربوا الفضل'' جس کو قرآن نے حرام قرار دیا ہے جس طرح مال معصوم میں حرام ہے ٹھیک اسی طرح مال غیر معصوم میں بھی حرام ہے۔

اور مشہور حدیث ''**کل ربا کان فی الجاھلیۃ فھو موضوع ان اول ربا یوضع ربا العباس بن عبدالمطلب**''(۱) سے تو صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ ''ربا'' کے تحقق کے لئے اموال کے معصوم ہونے کی شرط غلط ہے۔ اس لئے کہ جاہلیت کے ربوی معاملے جو غیر مسلموں نے اپنے خالص غیر معصوم اموال میں کئے تھے جن میں حضرت عباس کا ربوی معاملہ بھی تھا ان سب کو آنحضرت ﷺ نے ''ربوا'' قرار دے دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ''ربا'' کے پائے جانے کے لئے مال کے معصوم ہونے کی شرط وقید بے اصل وبے بنیاد ہے۔

(۹) انشورنس کا کاروبار خود حکومت کر رہی ہو یا نجی پبلک کمپنیاں کر رہی ہوں ان دونوں صورتوں کے درمیان شرعی حکم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ پس دونوں ہی صورتوں میں مسلمان کے لئے بیمہ پالیسی خریدنا جائز نہیں ہے۔

پبلک بیمہ کمپنی میں رعیت کے چند سرمایہ دار افراد اپنی ذاتی رقم لگائے بغیر انشورنس کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور بیمہ داروں کی رقم کو تجارت میں لگا کر جو سودی وغیر سودی ہر قسم کی ہوتی ہے اور لوگوں کو اعلیٰ شرح سود پر قرضہ دے کر یا جائداد خرید کر منافع حاصل کر کے اپنی ذاتی دولت اور سرمایہ بڑھاتے ہیں۔ اور امیر سے امیر تر بنتے جاتے ہیں، اور سرکاری کمپنی میں یہی کام حکمراں پارٹی کرتی ہے۔ پہلی قسم میں افراد رعیت سود خوری کا کاروبار کرتے ہیں، اور دوسری قسم میں خود حکومت یہی کام کرتی ہے۔ اور دوسری جائز وناجائز سرکاری آمدنیوں کی طرح اس ناجائز آمدنی کا بیشتر حصہ اونچے اور اوسط درجہ کے ملازمین کی تنخواہوں اور دیگر شرعاً غلط مصارف میں خرچ کرتی ہے۔

(۱۰) اس بنیاد پر کہ خزانۂ حکومت ہر فرد کا حق ہوتا ہے زیر بحث معاملہ میں

(۱) مسند احمد ۲۰۶۹۵۔

سود کی رقم کو حکومت کا عطیہ قرار دینا اور اس طرح سود کی رقم کو ''ربوا'' شرعی کے حدود سے خارج کرنا اور خارج سمجھنا غلط ہے۔

غیر مسلم حکومت کے خزانہ کو اسلامی حکومت کے خزانہ (بیت المال) پر قیاس کرنا انتہائی غلط بات ہے، اسلامی حکومت کے خزانہ کی آمدنی کی صورتیں، ذرائع اور مدات معلوم ومتعین ہیں، جو کتب فقہ میں بالتفصیل مذکور ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی مد اور ذریعہ آمدنی ایسا نہیں ہے جو شرعاً مشکوک مشتبہ ہو چہ جائیکہ صریح حرام وناجائز ہو پھر ہر ایک مد کا مصرف متعین ہے۔ سربراہ حکومت اور اس کے عمال کو یہ حق نہیں ہوتا ہے کہ کسی غلط ذریعۂ آمدنی سے بیت المال کو بڑھائے یا غلط اور ناجائز جگہ خرچ کرے۔ اور غیر مسلم حکومت کا معاملہ ایسا نہیں ہے پس یہ جانتے ہوئے کہ سرکاری بیمہ کمپنی بیمہ دار کو اس کی اصل رقم سے جس قدر زائد رقم دے رہی ہے بیمہ دار کو عام سرکاری خزانہ سے نہیں مل رہی ہے بلکہ خاص انشورنس کے کاروبار کی آمدنی سے مل رہی ہے اور بطور سود کے مل رہی ہے جو شرعاً مال خبیث ہے وہ حکومت کا عطیہ کیونکر قرار پاسکتی ہے؟ دیدہ ودانستہ اس مال خبیث کو حکومت کا عطیہ قرار دینا اور اس طرح اس کو حدود ربوا سے بالا سمجھ کر اپنے لئے حلال سمجھ لینا نہایت غلط بات ہے۔ حرام چیز کو حلال کرنے کا یہ ایک بھونڈا، مکروہ، اور مہمل حیلہ ہوگا۔ اعاذنا اللہ من ذلک۔

(۱۱) بغیر سخت مجبوری واضطرار کی حالت کے جس کی تفصیل (۲) میں گذر چکی ہے مسلمان کے لئے سرکاری بیمہ کمپنی سے بھی بیمہ پالیسی خریدنا جائز نہیں ہے۔ اگر غیر اضطراری حالت میں بیمہ پالیسی خریدے گا اور اصل کے ساتھ سود وصول کرے گا تو ربوی معاملہ وکاروبار میں امداد وتعاون کا اور ''ربوا'' لینے کا گناہ ضرور ہوگا۔ اگرچہ سود کی رقم (الف، ب، ج) میں بیان کردہ کاموں میں خرچ کردے۔ البتہ (۲) میں مبینہ اضطراریہ حالت میں بیمہ پالیسی خریدی ہے تو اضطرار کی وجہ سے تعاون علی الاثم کے جرم پر مواخذہ نہ ہوگا۔ لیکن خاص اس صورت میں سود کی رقم وصول کرکے الف میں بیان کردہ جگہ میں صرف کردے۔ یعنی سود کی وصول کردہ رقم کو ان ٹیکسوں اور چندوں کی صورت میں جو ظالمانہ

ہوں خود حکومت کو دے دے۔ اس صورت میں انشاء اللہ سود لینے کا گناہ نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ب اور ج میں مذکورہ امور میں سے کسی امر میں بھی سود کی رقم صرف نہ کرے۔ پل یا راستہ بنوانے، کنواں کھدوانے، نل لگوادینے، کسی بھی تعلیمی ادارے کو دیدینے لائبریری کھولنے وغیرہ رفاہ عام کے کاموں میں صرف کرنا اس لئے ٹھیک نہیں ہے کہ بیمہ پالیسی خرید کر سود وصول کرنے والا خود بھی اور دوسرا مسلمان بھی ان سب چیزوں سے فائدہ اٹھائیں گے اور خود اس کے لئے اور دوسرے مسلمانوں کے لئے ان چیزوں سے اجتناب واحتراز مشکل ہوگا۔ اور کسی بھی مسلمان کے لئے بغیر اضطرار شرعی کے سود کی رقم سے بلاواسطہ انتفاع درست نہیں ہے۔

(۱۲) بیمہ دار جس نے بحالت اضطرار بیمہ پالیسی خریدی ہے سود کی رقم بغیر نیت ثواب کے بھی کسی مسلم غیر مضطر کو دیتا ہے تو وہ ایک مسلمان کو مال حرام کھلانے کے گناہ کا ضرور مرتکب ہوگا۔

(الف، ب) مروجہ بیمہ کے بدل کی تلاش وتعیین اور اس کا خاکہ وڈھانچہ تیار کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا یہ سوال آسان ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ماہرین کی مجلس جو اسلامی اصولوں کو اچھی طرح جانتی ہو اور بیمہ کے معاملات کو بھی خوب سمجھتی ہو اس معاملہ کا جائزہ لے اور انشورنس کی مروجہ شکل میں ایسی ترمیم واصلاح کرے جو اس کو معصیت کے دائرہ سے خارج کردے اور مصالح مذکورہ کو فی الجملہ حاوی ہو۔ یا ایسا نعم البدل تلاش کرے جس میں مصالح مذکورہ ایک حد تک موجود ہوں، اور جو مفاسد سے یکسر خالی وپاک ہو اور اس میں ارتکاب معصیۃ کی کوئی صورت نہ ہو۔ افسوس ہے کہ یہ ناکارہ ایسی مجلس میں شامل ہونے کا اہل نہیں ہے۔

بیمہ کی موجودہ مروجہ شکل میں تین قباحتیں اور شرعی مفسدے سب سے اہم ہیں۔ اگر وہ ختم کردیئے جائیں تو بعض نظائر کی روشنی میں جن کا تذکرہ (۳) کے تحت گذر چکا ہے زندگی اور ذمہ داریوں کے بیمہ کے جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ پہلا مفسدہ اور قباحت یہ

ہے کہ بیمہ کرانے کے بعد اگر ایک آدھ قسط بھی ادا کرنے کے بعد بیمہ شدہ جائداد تلف ہوجائے تو کمپنی بیمہ کی پوری رقم اور اس کے ساتھ کچھ مزید رقم زیادہ شرح فیصد کے حساب سے بیمہ کرانے والے کو دیتی ہے اور جمع کی ہوئی اقساط سے زیادہ جس قدر بھی دیا جائے یہ بلاشبہ شرعاً اصطلاحی ربوا ہے۔

دوسرا مفسدہ یہ ہے کہ کمپنی بیمہ داروں سے وصول کی ہوئی رقموں کو سودی کاروبار میں لگاتی ہے اور دوسروں کو اعلیٰ شرح سود پر رقم قرض دیتی ہے۔ یہ سودی کاروبار اور سود پر قرض دینا شرعاً حرام ہے۔

تیسرا مفسدہ یہ ہے کہ کمپنی بہرحال بیمہ دار کو اصل رقم سے کچھ زائد بطور سود کے دینا شرط کرتی ہے۔ اور قانوناً اس کی پابندی ہوتی ہے، یہ شرط اور پابندی اور اس پر عمل ختم ہونا چاہئے۔

۱۹۶۴ء کے ابتدائی مہینوں میں ''المسلمون'' جینوا اور ''الرابطۃ الاسلامیۃ'' مکۃ المکرّمہ کی کسی اشاعت میں ''بنوک القرض بدون ربا'' کے عنوان سے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں کئی عملی جائز صورتیں ایسی ذکر کی گئی ہیں جن سے مسلمانوں کی اقتصادی مشکلات کم ہوسکتی ہیں۔ بیمہ یا اس کے بدل پر غور کرنے کے وقت اگر اس مضمون کو سامنے رکھا جائے تو مناسب ہوگا۔

عبید اللہ رحمانی مبارکپوری

●●●

جواب: مولانا سید احمد عروج قادری
(ایڈیٹر ماہنامہ زندگی)

محترم جناب کنوینر صاحب۔ مجلس تحقیقات شرعیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں سوالات کے جواب سے پہلے اپنی ایک الجھن کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں جو آپ کا سوالنامہ پڑھ کر مجھے پیش آئی ہے۔ تمہید میں آپ نے انشورنس کے معاملے کو سودی کاروبار قرار دیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ اس میں ربوا کے ساتھ ''غرر'' بھی پایا جاتا ہے، آپ نے ص ۳ پر لکھا ہے:

> ''حقیقت کے لحاظ سے انشورنس کا معاملہ ایک سودی کاروبار ہے جو بینک کے کاروبار کے مثل ہے دونوں میں جو فرق ہے وہ شکل کا ہے، حقیقت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، حقیقت میں اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس میں ربوا کے ساتھ ''غرر'' بھی پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے بیمہ کے ایسے دنیوی مصالح و مفاسد پیش کئے ہیں جن کا شریعت بھی اعتبار کرتی ہے اور پھر اہل علم کو دعوت دی ہے کہ ان مصالح و مفاسد کو سامنے رکھ کر سوالات کے جوابات تحریر کریں، الجھن یہ پیش آئی ہے کہ جب آپ نے انشورنس کو سودی کاروباری قرار دے دیا جو شریعت اسلامیہ میں بالاتفاق حرام قطعی ہے تو پھر اس کے بعد یہ مسئلہ اس لائق کہاں باقی رہتا ہے کہ اس کے جواز وعدم جواز پر گفتگو کی جائے مصالح و مفاسد کو سامنے رکھ کر انہیں معاملات کے جواز وعدم جواز پر گفتگو کی جاسکتی ہے جو اجتہادی ہوں نہ کہ وہ معاملات جن کو شریعت حرام قطعی قرار دے چکی ہے، اگر یہ سوال نامہ شائع کر دیا

جائے تو متجد دین اس سے یہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ کسی معاملے کو سودی قرار دے کر بھی گفتگو کی جاسکتی ہے اور اس کے جواز وعدم جواز کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے، اس حقیر کا خیال ہے کہ سوال نامے میں آپ کو اپنی رائے ظاہر نہ کرنی چاہئے تھی، بلکہ بیمہ کے صرف تعارف پر اکتفا کر کے سوالات قائم کرنے چاہئے تھے، اظہار رائے کے بعد سوالات قائم کرنے سے وہ الجھن بھی پیش آتی ہے جس کا ذکر اوپر گذرا اور مزید یہ کہ اس سے جواب دینے والوں کی رایوں پر اثر پڑنے کا بھی احتمال ہے۔

جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے انشورنس کا معاملہ متعدد محرمات قطعیہ کا مجموعہ ہے، اس میں ربوا، قمار، غرر، اسلامی قانون وراثت کی خلاف ورزی، سب داخل ہیں، اب میں نمبر وار سوالات کے جوابات عرض کرتا ہوں۔

(۱) انشورنس کمپنیاں اپنے بیمہ داروں کو بونس یا منافع کے نام سے جو فاضل رقم ادا کرتی ہیں وہ ٹھیک وہی ربوا ہے جس کو قرآن نے حرام قرار دیا ہے آپ نے تمہید میں لکھا ہے کہ:

> ''بیمہ کرانے والا کمپنی کو روپیہ قرض دیتا ہے اور کمپنی اس رقم سے سودی کاروبار یا تجارت وغیرہ کر کے نفع حاصل کرتی ہے اور اس نفع میں سے بیمہ کرانے والے کو بھی کچھ رقم بطور سود ادا کرتی ہے''۔ ص ۳

جب بیمہ دار کی دی ہوئی رقم قرض ہے تو پھر اسی پر فاضل دی ہوئی رقم ربوا النسیئۃ کے سوا اور کیا ہوگی، یہی وہ ربوا ہے جس کو قرآن نے حرام کہا ہے، دینے والا اسے بونس کہے یا منافع، لفظ کے بدلنے سے حقیقت میں فرق واقع نہ ہوگا، آخر سود بھی تو فارسی لفظ ہے جس کے لغوی معنی نفع ہی کے ہیں۔

(۲) میرے نزدیک مجلس تحقیقات شرعیہ کے سوال نامے میں اس سوال کی گنجائش نہ تھی، اپنی رقم قرض دے کر سود لینے کے معاملے کو قابل بحث وفیصلہ تسلیم کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔

(۳) ناجائز ہونے کی جہت سے ان تینوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کہ ربوا قمار، اور غرر کی خرابیاں تینوں میں موجود ہیں، ویسے شناعت میں میرے نزدیک زندگی کا بیمہ، املاک اور ذمہ داری کے بیمہ سے بڑھا ہوا ہے۔

(۴) اصلاً یہی چیز ہے جس کے لئے انشورنس کا کاروبار اب جاری ہے، ورنہ روپے جمع کر کے سود حاصل کرنے کے لئے تو لاکھوں بینک موجود ہی ہیں محض سود کے لئے بیمہ کرانے کی کیا ضرورت ہے، یہ شرط کہ طے شدہ رقم کی اقساط ادا ہو جانے سے پہلے اگر کوئی شخص مرجائے یا وہ مال تلف ہو جائے جس کا بیمہ کرایا گیا تھا تو بیمہ کمپنیاں پوری طے شدہ رقم ادا کر دیں گی، قمار کی حدود میں داخل ہے، بخت واتفاق سے ملنے والی اسی رقم کا لالچ دے کر انشورنس کمپنیاں کروڑوں اور اربوں کا سودی کاروبار کر رہی ہیں اور اب ان کمپنیوں نے بینکوں کے خبیث درخت کے لئے جڑوں کی حیثیت حاصل کر لی ہے، قمار کی بنیاد محض بخت واتفاق پر قائم ہوتی ہے اس لئے ہر ایسے معاملے پر قمار کی حقیقت صادق آئے گی جس میں محض بخت واتفاق کی بنیاد پر رقم حاصل کی جاسکتی ہو، تاش کے پتوں، ریس کے گھوڑوں اور پانسوں کے ذریعہ کھیلے جانے والے جوئے اور بیمہ کے اس کاروباری جوئے میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، جو کچھ کسر تھی وہ اس دوسری شرط نے پوری کر دی ہے کہ اگر بیمہ دار اقساط ادا نہ کر سکے تو اس کی دی ہوئی رقم سوخت ہو جاتی ہے اور یہ کوئی نظری بات نہیں ہے بلکہ اس شرط کی بناء پر ان کمپنیوں کو لاکھوں روپے بالکل مفت حاصل ہوتے ہیں، اور اسی قمار کی شرط نے اس کاروبار میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا کی ہیں، یہاں تک کہ وارث کا اپنے بیمہ دار مورث کو قتل کر دینا یا کرا دینا بھی نادر نہیں رہا ہے، یہ ایک مفسدہ بھی اتنا بڑا مفسدہ ہے کہ تمام مصلحت اس کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئی ہیں۔

(۵) اس سوال کے بارے میں بھی میرا وہی خیال ہے جو سوال (۲) کے بارے میں ہے، جب ہم نے کسی معاملے کو قمار تسلیم کر لیا تو اسے جائز قرار دینے کی بات ہم نہیں سوچ سکتے۔

(۶) بیمہ کا معاملہ صرف یہ تو نہیں ہے کہ دی ہوئی رقم پر سود لیا جائے یا نہ لیا جائے پھر اس میں اور بینک میں کوئی فرق باقی نہ رہے، اصلاً یہ کاروبار تو وہ ہے جس کا ذکر سوال ۴ میں گزرا اور جس کی تفصیل سوال نامے کی تمہید میں درج ہے، اس لئے اگر کوئی شخص سود نہ لے جب بھی وہ قمار اور غرر کے معاملے سے نہیں بچ سکے گا، بیمہ کے کاروبار پر بحیثیت مجموعی غور کیا جائے گا، صرف ایک جزء کو سامنے رکھ کر نہیں۔

(۷) اس سوال کا جواب سوال ۱ کے تحت گزر چکا قرض کی رقم پر جو مشروط فاضل رقم دی جائے گی وہ ربوا ہوگی اس کا نام چاہے جو کچھ بھی رکھ لیا جائے، ان کمپنیوں کے ''تبرع واحسان'' اور ''امداد'' کی حقیقت کھولنے کے لئے مقالے کی ضرورت ہے۔

(۸) ربوا اور قمار کی حرمت مطلق ہے، اس میں دارالاسلام اور دارالحرب کا کوئی فرق نہیں ہے، کتاب وسنت میں کوئی دلیل ایسی موجود نہیں ہے جو اس معاملے میں دار الحرب اور دارالاسلام کا فرق کرتی ہو، اس مسئلے میں امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہا اللہ تعالیٰ کا مسلک دلیل کے لحاظ سے انتہائی کمزور ہے۔ امام ابو یوسف اور جمہور ائمہ فقہ ہی کا مسلک صحیح ہے، اس حقیر نے فقہ حنفی کے اس جزئیے پر دو مقالے لکھے تھے جو معارف (۴۶ ج ۴) اور ترجمان القرآن (دسمبر ۴۶ و جنوری ۴۷ء) میں شائع ہو چکے ہیں، یہاں تمام دلائل پیش کر کے ان پر بحث کرنا موجب طوالت ہے، میرے نزدیک یہ معاملہ مسلمانوں کے لئے ہر جگہ ناجائز ہے، دارالاسلام ہو یا دارالحرب۔

(۹) فرق یہ ہے کہ خود حکومت کے اس کاروبار میں ملوث ہونے کی وجہ سے اس کی شناعت بڑھ گئی ہے، حکومت کا کام یہ تھا کہ وہ حوادث کے شکار اور مصیبت زدہ لوگوں کی واقعی امداد کرتی اور اگر وہ چاہتی تو اس کے لئے جائز ذرائع کا مہیا کرنا بھی آسان تھا لیکن وہ اپنے فرض سے غفلت برت کر اس ظالمانہ کاروبار کی پشت پناہی پر آمادہ ہوگئی ہے، اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ یہ کاروبار صحیح ہے یا غلط اگر غلط ہے اور یقیناً غلط ہے تو حکومت کی غلطی زیادہ شدید ہونی چاہئے کیونکہ اس کا کام غلطیوں کی اصلاح ہے نہ کہ غلطیوں کا ارتکاب۔

(۱۰) اس سوال کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ بیمہ کا کاروبار صرف سود لینے اور دینے کا معاملہ نہیں ہے، گفتگو بیمہ کے موضوع پر ہو رہی ہے یا صرف سود لینے اور دینے کے معاملے پر؟ دوسری بات یہ کہ پھر بیمہ میں کوئی اسٹیٹ بینک میں روپے جمع کر کے اس کا سود لینا بھی جائز ہونا چاہئے، اور حکومت سے ہر غلط مالی معاملہ صحیح ہونا چاہئے اس لئے کہ اس کے خزانے میں رعیت کے ہر فرد کا حق ہے اور جو غلط رقم بھی اس کی طرف سے ملے اس کو عطیہ قرار دے لینا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے خزانے میں غیر متعین اور لامعلوم حق کی بنیاد پر سودی رقم کو عطیہ قرار دینا صحیح نہیں ہے؟ بیمہ کا معاملہ ایک پابند قواعد وضوابط معاملہ ہے، اور انہیں کے لحاظ سے اس کے کسی جزء کا فیصلہ ہوگا، یہ کاروبار نجی کمپنیاں کریں یا حکومت، قرض دیئے ہوئے روپوں پر مشروط فاضل رقم ربوا ہے، اداروں کے بدلنے سے اس میں فرق واقع نہ ہوگا۔

(۱۱) اس سوال میں بھی بیمہ کے پورے کاروبار کے بجائے صرف سود کو سامنے رکھا گیا ہے، اگر روپے جمع کرتے وقت سود لینے کی نیت نہ تھی تو اخذ ربوا کے گناہ سے تو شاید بچ جائے لیکن بیمہ کے اس پورے معاملہ میں شرکت کے گناہ سے نہیں بچ سکتا، اس لئے بیمہ کی پالیسی کی خریداری اس کے لئے جائز نہ ہوگی، خریداری کے لحاظ سے الف۔ب۔ج کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بیمہ کی پالیسی کی خریداری صرف سود کی وجہ سے ناجائز نہیں ہے بلکہ بیمہ کا معاملہ متعدد محرمات کا مجموعہ ہے۔

(۱۲) اس سوال میں بھی صرف سود کو سامنے رکھا گیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہید میں بیمہ کی حقیقت اور اس کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد ایسے سوالات کیوں قائم کئے گئے ہیں، جن سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ بیمہ کی حرمت صرف سود کی وجہ سے ہے۔

بیمہ کا معاملہ چونکہ صرف سود کی وجہ سے حرام نہیں ہے، اس لئے اس صورت میں بھی انشورنس کا معاملہ ناجائز ہی رہے گا۔

اخیر میں (الف) اور (ب) کے تحت جو دو سوالات قائم کیے گئے ہیں اس سلسلہ

میں عرض یہ ہے کہ اصل میں ہم مسلمانوں کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہاں اسلامی نظام نافذ نہیں جو ہمارے تمام مسائل ومشکلات کا بہترین حل اور تمام مصائب وحوادث کا پاکیزہ ترین علاج ہے، اسلام کا نظام زکوۃ، نظام ارزاق وعطایا، نظام معاقل، نظام اوقاف، آفت ارضی وسماوی کے نقصان کو دور کرنے کے لئے مسلم معاشرے سے استمداد اور اس طرح کی دوسری چیزیں ان حاجات ومصالح اور ان حوادث ومصائب کا بہترین حل پیش کرتی ہیں، جن کو حل کرنے کی مدعی یہ انشورنس کمپنیاں ہیں لیکن اب یہ تمام نظامات، معطل اور بے کار ہو چکے ہیں اور ہمارے پاس کوئی تنفیذی قوت نہیں جو انہیں از سر نو جاری اور نافذ کر سکے، اس کے علاوہ اگر بدرجۂ اقل، کثیر سرمایہ اور قانونی وحکومتی تحفظ ہمیں حاصل ہوتا تو کسی درجے میں ہم کوئی عملی اسکیم مرتب کر کے چلا سکتے تھے، لیکن یہ بھی ہمیں حاصل نہیں، ایسی صورت میں مسلمانوں کے سامنے دو راستے ہیں ایک یہ کہ محرمات کا ارتکاب کر کے دینی واخروی نقصان برداشت کرنے کے بجائے مادی ودنیوی نقصانات انگیز کریں اور اپنی تمام توجہ خدا کی اطاعت پر مرکوز کر کے اپنے آپ کو اس کی مدد کا مستحق بنائیں، دوسرا یہ کہ ناجائز کو جائز کرنے کے حیلے تلاش کریں یا حلال وحرام کی تمیز ختم کر کے جو کچھ حاصل کر سکتے ہوں حاصل کریں اور جن مالی و جانی نقصانات سے بچ سکتے ہوں بچیں، میرے نزدیک پہلا راستہ صحیح اور دوسرا غلط ہے، اس مختصر تمہید کے بعد آپ کے سوال الف اور ب کا جواب عرض کرتا ہوں۔

(الف) میرے نزدیک ایک غیر سودی بینکنگ اسکیم جس کا ایک شبہ، محرمات سے پاک انشورنس بھی ہو، مسلمانوں کے معاشی مصالح کے حصول کا حل ہے، انشورنس کے لئے اسلام کے نظام معاقل اور مسلم معاشرے کے جذبۂ انفاق سے استمداد کی نظیر کو سامنے رکھا جا سکتا ہے، اس کام کے لئے ایسے مسلم ماہرین معاشیات سے مدد لینی ہوگی جو سودی کاروبار اور موجودہ انشورنس کو خود بھی ناجائز سمجھتے ہوں ایسی اسکیم پر کچھ مواد موجود بھی ہے، اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ (ب) انشورنس کی مروجہ شکل میں ترمیم کا بھی اختیار حاصل

نہیں اس لئے اس سوال کا مطلب شاید یہ ہوگا کہ مسلمان خود کوئی ایسی انشورنس کمپنی قائم کریں جو معصیت کے دائرے سے خارج ہو، اگر مطلب یہی ہے تو اس کا جواب (الف) میں گزر چکا۔

سید احمد قادری

●●●

تحریر: مولانا عبدالسلام ندوی

مکرمی السلام علیکم

بیمہ کے سلسلہ میں آپ کا سوالنامہ مدت ہوئی ملا تھا یہاں بعض ماہرین معاشیات سے مشورہ کیا دوسرے اہل علم سے بھی تبادلۂ خیال کیا، اس زمانہ میں جب فسادات کی بلا عام ہوگئی ہے تجارت پیشہ اصحاب اور صاحبان املاک کے لئے تو ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اپنی دوکان، فیکٹری اور مکانوں وغیرہ کا بیمہ کرالیں تاکہ نقصان سے محفوظ رہیں یا اس کی تلافی ہو سکے۔

ان خطرناک حالات میں زندگی کا بیمہ بھی پس ماندگان کے لئے بہت مفید ہے جب مسلمان عام طور سے جان اور املاک کا بیمہ کرالیں گے تو مالی زد سے بڑی حد تک انشاء اللہ محفوظ ہو جائیں گے، اور جانوں کی حفاظت کا بھی زیادہ امکان ہو جائے گا کیونکہ فساد کرانے والے گروہ نقصان جان و مال کی ذمہ داری زیادہ محسوس کریں گے ممکن ہے اس کی وجہ سے فسادات بھی کم ہو جائیں۔

بیمہ کی یہ مصلحت تو بالکل واضح ہے شرعی نقطہ نظر سے کچھ اشخاص کا ایسا معاہدہ کرنا کہ اگر ہم میں سے کسی کو نقصان پہنچ جائے یا اس کی موت ہو جائے تو باقی ماندہ اشخاص اس کے نقصان کی تلافی کریں گے اور اس کے پس ماندگان کو مدد دیں گے، تعاون علی الخیر کی ایک صورت ہے، موجودہ معاشی زندگی میں ربا کا بہت دخل ہے، یہی سود کی علت بیمہ میں بھی ہے لیکن سود بیمہ کا مقصد نہیں ہے بلکہ موجودہ مالیاتی نظام کا ایک رواج ہے اس لئے جس طرح بینک کے سود کے بارے میں بہت سے علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ اسے لے کر کسی مفید کام میں صرف کر دیا جائے اپنی ذات پر صرف نہ کیا جائے اسی طرح بیمہ کی سودی رقم کے بارے میں کچھ کیا جائے، ہمارے زمانہ میں جو گرانی روز افزوں ہے دوسرے الفاظ میں روپیہ کی وقعت کم

ہوتی جارہی ہے، اس صورت میں ہماری جمع شدہ رقم پر جو اضافہ سود کے نام پر ملتا ہے وہ بے حقیقت ہو جاتا ہے کیونکہ جس وقت ہم نے روپیہ جمع کئے تھے اس وقت ان کی قوت خرید بہت زیادہ تھی اور جب برسوں کے بعد پھر وصولی کرتے ہیں تو روپیہ قوت خرید کے اعتبار سے بہت کم ہو جاتا ہے ایسی صورت میں اضافہ حقیقی نہیں بلکہ عددی ہے اس لئے اس بارہ میں غور کرتے وقت یہ پہلو بھی پیش نظر رہے، بہر حال اپنے مقصد و مصلحت اور موجودہ حالات کے پیش نظر بیمہ کی اجازت میں کوئی اختلاف نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ بعض اعتبارات سے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور بیمہ کرانا فعل مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے۔ فقط۔

عبدالسلام

●●●

جواب: مولانا محمد میاں صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی

گرامی نامہ مئومؤرخہ ۲۵ ستمبر باعث سرفرازی ہوا تھا، اس سے تقریباً دو ماہ پہلے جوابات کا مجموعہ پہنچ چکا تھا، احقر نے ہر ایک جواب کو پڑھا اور اس سے مسرت ہوئی کہ حضرات علماء نے سوالات کی اہمیت کو محسوس فرمایا، اور کافی تحقیق سے جوابات تحریر فرمائے، یہ احقر نہ اتنی قابلیت رکھتا ہے کہ اس طرح شرح وبسط کے ساتھ جوابات لکھ سکے یا موصولہ جوابات پر تفصیلی بحث کر سکے اور نہ اوقات فرصت ہیں کہ جن کی مقدار عموماً صفر کے برابر رہتی ہے اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ لایتجزی کا تجزیہ کر سکے، صرف چند باتیں عرض کرتا ہوں جو امید ہے کہ نتیجہ خیز ہوں گی، اور موصولہ جوابات کے متعلق تبصرہ کا درجہ بھی رکھیں گی۔

(۱) سب سے پہلے قابل توجہ یہ ہے کہ ربوا، قمار اور میسر کی حرمت اضافی ہے کہ سیاسی ماحول یا جغرافیائی حدود کی بنا پر پیدا ہو جاتی ہے، یا خود ان کی فطرت خبیث ہے اور اس بناء پر ان کا عمل حرام اور عمل کی بناء پر جو ملک پیدا ہو وہ ملک خبیث ہے۔

سیاق کتاب اللہ میں اطلاق ہے، نہ ظروف کی قید ہے نہ حالات وکیفیات کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے نصاریٰ سے معاہدہ کیا تو ایک شرط یہ بھی تھی کہ سودی کاروبار ترک کر دیں گے۔ مبسوط ج ۱۴ باب الصرف فی دار الحرب

صرف امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے ''لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب'' لیکن یہ قانون کی حد تک ہے، یا اس سے ربوا کی فطرت بھی بدل جاتی ہے۔

امام صاحب کے مسلک پر مسائل کی تخریج کرتے ہوئے سرخسی رحمۃ اللہ نے

فرمایا ہے کہ ''اگر دار الحرب کے رہنے والے مسلمان آپس میں سودی لین دین کر لیں تو ملک ثابت ہو جائے گی، لیکن کراہت باقی رہے گی، کیونکہ ان کا یہ فعل ان کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ باب الصرف فی دار الحرب مبسوط ج ۱۴

البتہ حربی سے معاملہ کرتے ہوئے وہ اثم کی بھی نفی کرتے ہیں، لیکن ان کے پیش نظر صرف یہ ہے: ''**لان مالهم مباح فی دارهم فبای طریق اخذه المسلم اخذ مالاً مباحاً اذا لم یکن فیه غدر**'' (ہدایہ ۳/۸۶)

باقی یہ بات کہ مسلمان نے ایسا فعل کیا ہے جس کو سیاق کتاب اللہ نے علی الاطلاق ظلم اور اثم قرار دیا ہے، اس پہلو پر بظاہر توجہ نہیں فرمائی، حالانکہ یہ بھی بہت زیادہ قابل توجہ ہے، خصوصاً جب کہ معاملہ ایک دو فرد کا نہ ہو بلکہ پوری امت کے مزاج پر اثر انداز ہو رہا ہو، اور ربوا بھی ربوا فی البیع نہ ہو، جس پر امام سرخی نے بحث کی ہے، بلکہ ربوا النسیئہ کا معاملہ ہو، جو فی الواقع اشد الربوا ہے۔

(۲) ہندوستان دار السلام یقیناً نہیں ہے، لیکن حضرات فقہاء نے اس کو من کل الوجوہ دار الحرب اور یہاں کے غیر مسلم باشندوں کو محارب حربی بھی قرار نہیں دیا، جہاں تک عبادات ومعاملات کا تعلق ہے وہ ہی فتاویٰ دیئے جاتے ہیں جو دار اسلام میں دیئے جاتے ہیں، اگر من کل الوجوہ دار الحرب قرار دے کر احکام پر نظر ڈالی جائے تو اس سے برصغیر میں اسلامیات کا سارا نظام خود مسلمانوں کے ہاتھوں درہم برہم ہو جائے گا، بہت سے حقوق سے دست بردار ہونا پڑے گا اور بہت سے فرائض سے سبکدوشی ہو جائے گی۔

(۳) دفع مضرت کی حد تک ناجائز کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے، لان الضرر یزال والضرورات تبیح المحظورات، لیکن جلب منفعت کے لئے جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۴) وارثوں کے لئے پس انداز کرنا عند الشرع محمود ہے: **انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیر من ان تذرهم عالةً یتکففون الناس (او کماقال صلی الله علیه وسلم)** (۱) لیکن اگر بطریق شح ہو تو لامحالہ حرام ہے، **قال رسول الله صلی**

(۱) صحیح بخاری ۳/۶۳۷۔

اللہ علیہ وسلم اتقوا الشح فان الشح اھلک من کان قبلکم ، حملھم علی ان سفکوا دماء ھم واستحلوا محارمھم (۱)(مسلم شریف باب تحریم الظلہ)
وقال اللہ تعالیٰ ومن یوق شح نفسہ فالئک ھم المفلحون۔ (۲)

ان مقدمات کی بناء پر احقر مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب جیسے حضرات کے فتاویٰ کی تائید کرتا ہے، جن میں زندگی کے بیمہ کو ناجائز اور دوسرے بیموں کو عند الضرورت حسب ضرورت جائز فرمایا گیا ہے، خصوصاً مولانا ولی حسن صاحب مدظلہ العالی کا فتویٰ جس کی تصدیق مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ نے فرمائی، بہت واضح، مدلل، وافی اور شافی ہے، جزاھم اللہ، احقر کا خیال ہے کہ اس کو یا مذکورہ بالا تینوں فتووں کو طبع کرا کر علماء کرام سے تصدیقات حاصل کر لی جائیں تو ایک متفقہ فیصلہ سامنے آجائے گا جو مجلس تحقیقات شرعیہ کی ایک قابل قدر خدمت ہوگی۔

والسلام
نیاز مند محتاج دعا
محمد میاں
۲/رجب المرجب ۸۵ھ
۲۸/اکتوبر ۶۵ء
مہربانی فرما کر رسید بقیہ کی اطلاع سے مطمئن اور ممنون فرمائیں

●●●

(۱) البدایۃ والنہایۃ ۹/۲۵۱۔ (۲) سورہ حشر:۹۔

مکتوب مولانا قاری محمد طیب صاحب

حضرت المحترم زید مجدکم

سلام مسنون نیاز مقرون، گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، ،مسئلہ انشورنس کے بارے میں حضرت کے ارسال فرمودہ مضامین جو مختلف حضرات مفتیان کرام کے تحریر فرمودہ ہیں مجلس علماء میں سنائے گئے، احقر بھی حاضر تھا، دو مضامین زیادہ پسند کئے گئے، ایک حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب دامت برکاتہم کا جو فن کے اعتبار سے موزوں تھا، دوسرا مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا جو تدبیر اور بدل کے لحاظ سے زیادہ موزوں تھا، اس وقت والا نامہ آنے پر خیال تھا کہ یہ ہی لکھ دوں کہ حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کی رائے کے مطابق ہم سب کی رائے تھی، پھر بھی احتیاطاً میں نے حضرت مخدوم سے دریافت کرایا، اور انہوں نے چند سطریں تحریر بھی فرمادی، اسی کو ہم سب کی طرف سے سمجھا جائے، اور وہ یہ ہے کہ:

انشورنس میں سود کا ہونا ظاہر ہے، ساتھ ہی اس میں قمار اور اعانت علی المعصیت بھی ہے جو اسلامی نقطہ نظر سے سند جواز لئے ہوئے نہیں ہے، لیکن جن ممالک میں بیمہ کرانے کا قانون نافذ ہے وہاں مجبوری ہے، بیمہ کرانا ہی پڑتا ہے، اور جہاں جبری قانون نہیں ہے لیکن اقتدار اس کا غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو اور اس میں غلبہ وقہر کے تحت جملہ امور نافذ ہوں، ہر سیاہ وسفید انہیں کے ہاتھوں میں ہو ایسے ممالک میں عقود فاسدہ کے تحت قول امام ابی حنیفہ کے مطابق اجازت ہے، انہی عقود فاسدہ میں انشورنس بھی داخل ہے جس کی اجازت ہوگی، **ولا ربوا بین حربی ومستامن ولو بعقد فاسد ولو بقمار ثمہ، لان مالہ ثم مباح فیحل برضاہ مطلقاً بلا غدر** ، آہ درمختار۔

شامی ۵/۱۸۶۔

کچھ ممالک میں قتل و غارتگری آتش زنی وغیرہ کا بازار آئے دن گرم رہتا ہو اور مسلمان کو ہر وقت جان و مال کے ضائع ہونے کا خوف غالب رہتا ہو وہاں بھی بیمہ کرا لینے میں مضائقہ نہیں ہے، امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا، محترمی مولانا علی میاں صاحب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔

والسلام

محمد طیب از دیوبند

●●●

جواب: مولانا عبدالماجد دریابادی

ہفتہ وار صدق جدید

اکتوبر ۱۹۶۵ء دریاباد ضلع بارہ بنکی

کرم گستر و علیکم السلام

انشورنس کے دقیق مسئلہ پر ایک بے علم اپنی رائے کیا پیش کر سکتا ہے، صرف تعمیل ارشاد میں یہ عرض ہے کہ مختلف و متعدد علماء کے بیانات سے اس نتیجہ پر پہنچ سکا ہوں کہ روح اسلام و مغز شریعت میں تو انشورنس کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، تاہم اس کی قطعی حرمت پر ہمارے سامنے کوئی واضح دلیل موجود نہیں۔

والسلام

دعا گو

عبدالماجد

●●●

مکتوب پروفیسر عبدالوہاب بخاری (نیوکالج، مدراس)

مکرمی زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، میں کچھ دن سے علیل ہوں، لیکن کئی مرتبہ آپ نے متوجہ کیا ہے اس لئے جو مجھ سے ہوسکا لکھ دیا، اس لئے آپ کو حق ہے کہ اس میں ترمیم فرمائیں، مجھے معلوم ہے کہ آپ اس کمی بیشی سے میرے خیالات کو متاثر نہ ہونے دیں گے۔

انشورنس کا مسئلہ بہت سے دیگر معاشی مسائل سے تعلق رکھتا ہے، مثلاً یہ کہ بینک کا منافع وغیرہ، معاشی مسائل سے ہٹ کر بہت سے ایسے سماجی مسائل ہیں جن کے جواز یا عدم جواز پر بحث ہے، جامعۃ الازھر نے ان مسائل کو ہاتھ میں لیا ہے، تاکہ ان مسائل کی تنقیح ہو اور اجماع نہ سہی کم از کم اکثریت علماء کسی رائے پر متفق ہوجائے، گذشتہ سال غالباً مولانا طیب صاحب پھر وہاں گئے تھے، امسال مولانا سعید صاحب اکبرآبادی اور ان کے خادم کو بھیجا گیا تھا، بہت سے مسائل پر بحثیں ہوئیں۔

بینک کے سود اور انشورنس وحجاب وغیرہ پر مقالے پڑھے گئے، نئی کمیٹیاں بنائی گئیں، سال بھر میں اس پر بہت کام ہوا، ان کے نتائج کو عالمی علماء کانفرنس میں پیش کیا جائے گا، یہ مسائل مدت سے مشتبہ ہیں، قوم کے افراد کی ان مسائل میں رہبری کی کوئی شکل نہ تھی، مصر نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے، اللہ کرے ان کے یہ مساعی کامیاب ہوں۔

یہ دین قیامت تک رہے گا، سماج کے حالات بدلتے رہیں گے، دین کے محکمات

اپنی جگہ قائم ہیں، مثلاً روزہ نماز حج زکوٰۃ وغیرہ ان میں تبدیلی الحاد کے مساوی ہوگی لیکن سماج کی ہر جزوی چیز کو معین دین کے برابر کرنا یہ بھی دین میں زیادتی ہوگی، ترمذی شریف کی ایک حدیث میں آیا ہے، سیدنا ابوہریرہ کی روایت ہے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''انکم فی زمن من ترك عشر ما امر به هلك ، ثم یاتی زمان من عمل منهم بعشر ما امر به نجا۔'' (رواہ الترمذی)

کتاب وسنت کی روشنی میں انشورنس بینک کے معاملات ان کی شکل اب تجارت کی ہوگئی ہے کیونکہ طرفین کو اس میں فائدہ ہے۔

اسی کی طرف علمائے مصر وشام کا رجحان ہے، خادم کی رائے میں انشورنس جائز ہے کہ الید العلیا خیر من الید السفلی۔

بندہ کے احتیاط سے رب کی رزاقیت پر حرف نہیں آتا۔

طرفہ یہ کہ وہ حضرات جو بینک کے نفع کے عدم جواز کے قائل ہیں وہ اپنے اداروں اور دینی مدرسوں کے لئے ان تاجروں سے سالانہ امداد لیا کرتے ہیں جن کا معاملہ بینکوں کے بغیر چل نہیں پاتا، دین میں کافی لچک ہے اور اسی لئے تو ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ دین رہتی دنیا تک باقی رہے گا، اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے، تاکہ امت دین کے ہمہ گیر آسرے میں رہ کر نفاق سے بچ سکے، آج ہم کہہ کچھ رہے ہیں اور کر کچھ رہے ہیں۔

خط لمبا ہوگیا، جس قدر ضروری ہو آپ اس کو رکھوائیں باقی حذف فرمادیں، میری ایک کتاب اس موضوع پر عنقریب شائع ہونے والی ہے، آپ کے پاس بھی بھیجی جائے گی، والسلام۔

●●●

مکتوب مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ومحترمی! زیدمجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انشورنس کے مسئلے میں مختلف علماء کے جوابات اور افکار وآراء پر نظر کرنے کے بعد بھی میری وہی رائے ہے جس کو میں سوالنامہ کے جواب میں بالتفصیل عرض کر چکا ہوں یعنی یہ کہ مروجہ بیمہ کی تینوں قسمیں، ربا، قمار، غرر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شرعاً ناجائز ہیں۔

عبیداللہ رحمانی مبارکپوری

قصبہ مبارکپور

ضلع اعظم گڑھ

●●●

تجویز۔مجلس تحقیقات شرعیہ

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مجلس تحقیقات شرعیہ نے اپنے اجتماع مؤرخہ ۱۵، ۱۶/دسمبر ۱۹۶۵ء میں انشورنس کے مسئلہ پر علماء کرام کے ان جوابات کی روشنی میں غور کیا جو مجلس کے سوالنامے کے پیش نظر ان حضرات نے تحریر فرمائے تھے، اس غور وخوض کے بعد مجلس جس نتیجہ پر پہونچی ہے وہ ایک مختصر تمہید کے ساتھ درج ذیل ہے:

انشورنس کا مسئلہ شریعت کے شعبۂ معاملات سے تعلق رکھتا ہے، معاملات میں ہمیشہ دوفریق ہوتے ہیں، اس لئے اس کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں:

اول۔دونوں فریق مسلمان ہوں، اس صورت میں معاملات کی جوشکلیں شریعت اسلامیہ نے مقرر کی ہیں، ان کے علاوہ کسی شکل کا اختیار کرنا کسی حال میں جائز نہیں ہے۔

دوم۔ایک فریق مسلمان ہو، اور دوسرا غیر مسلم ہو، صورت دوم کی دوشکلیں نکلتی ہیں:

الف۔معاملات کی شکل مقرر کرنا مسلمان کے اختیار میں ہو، اس کا حکم بھی وہی جو صورت اولی کا ہے۔

ب۔معاملہ کی شکل مقرر کرنا اس کے اختیار میں نہ ہو۔

صورت ثانیہ کی شکل (ب) میں بوقت ضرورت اسلام کے بعض جلیل القدر ائمہ وفقہاء کے قول کی بناء پر شرعاً اس کی گنجائش نکلتی ہے کہ مسلمان کچھ قیود وشرائط کے ساتھ اس نوع کے معاملات میں حصہ لے سکے، انشورنس کا مسئلہ بھی مجلس کے نزدیک اسی شکل کے تحت داخل ہے۔

مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگر چہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے ربواوقمار لازم ہے، اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اسلامی اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب ہے، لیکن جان و مال کے تحفظ و بقا کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے، مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے، نیز مجلس اس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی راستوں سے انشورنس انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں، اور جان و مال کے تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائیداد کا بیمہ کرائے تو مذکورہ بالا ائمہ کرام کے قول کی بناء پر شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

تنبیہ۔ اوپر کی عبارت میں لفظ 'ضرورت شدیدہ' سے مراد یہ ہے کہ جان یا اہل وعیال یا مال کے ناقابل برداشت نقصان کا اندیشہ قوی ہو۔

'ضرورت شدیدہ' موجود ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مجلس کے نزدیک مبتلیٰ بہ کی رائے پر منحصر ہے، جو خود کو عنداللہ جوابدہ سمجھ کر علماء کے مشورہ سے قائم کرے۔ فقط

(مجلس تحقیقات شرعیہ کے دو اہم فیصلے، ص: ۱۴، ۱۵)

●●●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انشورنس کے بارے میں مجلس تحقیقات شرعیہ کا فیصلہ دسمبر ۱۹۶۵ء میں آیا، جس کی پوری تفصیل مذکورہ بالا صفحات میں آچکی ہے، انشورنس کے مسئلہ پر غور وخوض کرنے کا پس منظر بھی بیان کیا جاچکا ہے، مجلس تحقیقات شرعیہ کے فیصلے سے بعض علماء اور اصحاب افتاء نے اختلاف بھی کیا اور نئے مسائل کے جواب میں اختلاف کا ہو جانا کوئی حیرت انگریز چیز نہیں ہے، ملک کے حالات کم وبیش ویسے ہی رہے جو انشورنس کے بارے میں مجلس کے فیصلے کے وقت تھے، بلکہ حالات کی سنگینی بڑھتی رہی، ملک کے بعض صوبوں میں بڑے خطرناک فسادات ہوئے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور ان کے املاک کو انتہائی بے دردی کے ساتھ برباد کیا گیا، حالات کا یہ دباؤ اتنا بڑھا کہ جنوری ۱۹۹۱ء میں جمعیت علماء ہند کے تحت قائم ادارہ مباحث فقہیہ کے ناظم جناب مولانا معزالدین احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سوالنامہ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کو بھیجا، جس کا جواب دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خیرآبادی نے تحریر فرمایا اور اس فتوے پر دارالعلوم دیوبند کے مفتیان کرام اور اکابر اساتذہ کے دستخط کرائے گئے اور استفتاء اور اس کا جواب ادارہ مباحث فقہیہ جمعیت علمائے ہند نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا، اسی طرح فسادات ہی کے پس منظر میں اسلامی فقہ اکیڈمی کے پانچویں فقہی سمینار منعقدہ ۳۰/اکتوبر تا ۲/نومبر ۱۹۹۲ء میں انشورنس کے بارے میں فیصلہ کیا گیا جس پر ترپین ۵۳ علمائے کرام اور اصحاب افتاء کے دستخط ہیں۔

اس کے بعد ادارہ مباحث فقہیہ جمعیت علمائے ہند اور اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے متعدد فیصلے انشورنس اور میڈیکل انشورنس کے بارے میں آئے ان سب کو ہم یہاں شامل اشاعت کرتے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ہندوستان کے یہ دونوں مؤقر ادارے اجتماعی غور وخوض کے نتیجے میں انشورنس اور کی مختلف شکلوں کے بارے میں کہاں تک پہونچے ہیں۔

عتیق احمد بستوی

(ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

ملک کے موجودہ حالات میں
بیمہ (انشورنس) کا شرعی حکم

آج ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود وتشخص کو مٹانے اور اقتصادی ومعاشی اعتبار سے ان کو تباہ وبرباد کرنے کی جو منظّم کوششیں ہورہی ہیں اور جس طرح مسلمانوں کی نسل کشی ہورہی ہے اور فسادات میں چن چن کر مسلمانوں کے املاک کو، دکان، مکانوں، صنعتوں، کارخانوں اور کھیتیوں کو لوٹا، جلایا اور تباہ وبرباد کیا جاتا ہے، وہ مخفی اور پوشیدہ امر نہیں جب کہ اس ملک کا نظام حکومت سیکولر اور جمہوری ہے جس میں تمام باشندوں کو بلاتفریق مذہب وملت برابر کے حقوق حاصل ہیں، اور آئینی اعتبار سے تمام لوگوں کے جان ومال کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری ہے، اس کے باوجود حکمران مشنری اور ذمہ داران امن وامان کسی بھی طرح مسلمانوں کے جان ومال کی حفاظت کا بندوبست نہیں کرتے، یہ امن وامان کے محافظ نہ صرف مجرمانہ غفلت برتتے ہیں بلکہ خود فسادیوں اور فرقہ پرستوں کے ساتھ مل کر لوٹ مار اور قتل وغارت گری میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، اور کھلی جانب داری کا ثبوت دیتے ہیں، قانونی چارہ جوئی، نامزد رپورٹ ایف، آئی، آر اور نشاندہی کے باوجود مسلمانوں کا لوٹا ہوا مال برآمد نہیں کیا جاتا اور نہ ہی فسادیوں کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی کی جاتی ہے، نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ مسلمانوں کے اسلامی معابد اور شعائر تک محفوظ نہیں، فسادات میں سینکڑوں مسجدوں کو جلایا اور نقصان پہونچایا گیا ہے، یہاں تک کہ مسجدوں پر قبضہ کرکے مورتیاں تک رکھ دی جاتی ہیں، اور ان کو مندر کہا جاتا ہے، یہ نازک ترین اور پرخطر صورتِ حال کسی خاص مقام اور علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ

ملک کا گوشہ گوشہ اور قریہ قریہ اس خطرے سے دوچار ہے، کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ یہ صورت حال پیش آسکتی ہے، جس کے نتیجہ مین پورے ملک کا مسلمان اپنی جان اور اپنے املاک کو غیر محفوظ سمجھ رہا ہے جو حقیقت واقعہ بھی ہے۔

اس نازک ترین صورت حال میں مسلمانوں کو تباہی وبربادی اور اقتصادی بدحالی سے بچانے کے لئے کیا یہ مشورہ دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی جان، اپنے املاک، دکان، کارخانہ، تجارت، صنعت وحرفت اور کھیتی وغیرہ کا انشورڈ (بیمہ) کرالین اس سے کافی حد تک املاک وغیرہ کی حفاظت ہوسکتی ہے کیونکہ فسادزدہ مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ فسادی کا اس کا علم ہوکر کہ یہ املاک انشورڈ شدہ ہیں نقصان نہیں پہنچاتے نیز چونکہ تمام بیمہ کمپنیاں سرکاری ہوتی ہیں اس لئے ظن غالب بلکہ یقین ہے کہ مسلمانوں کے زیادہ تعداد میں انشورڈ کرانے کی صورت میں حکومت مسلمانوں کے جان ومال کے تحفظ کا معقول بندوبست کرے گی، کیونکہ عدم تحفظ کی صورت میں سارا نقصان حکومت کو برداشت کرنا پڑے گا، اور اگر خدانخواستہ بیمہ کے بعد نقصان ہوجاتا ہے تو بیمہ کمپنیاں اتنی رقم دے دیتی ہیں، جس سے کافی حد تک نقصان کی تلافی ہوسکتی ہے اور فسادیوں کی مقصد برآری نہیں ہوپاتی۔

واضح رہے کہ بیمہ کی مروجہ صورتوں میں زندگی کے بیمہ میں پالیسی لینے والا بالاقساط رقم اس شرط پر کمپنی کو ادا کرتا ہے کہ اگر وہ متعینہ مدت میں فوت ہوگیا تو اس کے خاندان اور ورثاء کو کمپنی اتنی مقدار رقم ادا کرے گی، جس پر بیمہ ہوا ہے اور معینہ مدت کے بعد زندہ رہنے کی صورت میں پالیسی لینے والا اپنی پوری جمع کردہ رقم مع سود کے پانے کا حقدار ہوگا، جب کہ املاک اور ذرائع حمل ونقل کے بیمہ میں عدم حادثہ اور متوقع خطرہ نہ پیش آنے کی صورت میں جمع کی جانے والی رقم میں سے کچھ بھی کسی بھی وقت واپس نہیں کی جاتی۔

مذکورہ صورت حال میں اگر بیمہ کی اجازت اور گنجائش ہے تو کیا بیمہ میں حاصل ہونے والی پوری رقم کا حکومت کی جانب سے عطیہ یا ضمان سمجھ کر تصرف میں لانا درست ہوگا یا صرف جمع کردہ رقم کے بقدر ہی قابل استعمال ہوگا، شریعت مطہرہ کی روشنی میں اس صورت

حال میں بالتفصیل بیمہ (انشورنس) کا حکم مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور اور عندالناس مشکور ہوں۔

والسلام

معزالدین احمد غفرلہ

خادم، ادارہ مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند

●●●

جواب

مولانا حبیب الرحمٰن خیرآبادیؒ

مفتی دارالعلوم، دیوبند

الجواب وباللہ التوفیق!

بیمہ خواہ جان کا ہو یا املاک کا اس پالیسی میں مخاطرہ، قمار اور سود کی شکلیں پائی جاتی ہیں، اور قمار وسود کی حرمت قرآن پاک میں منصوص ہے، اس پالیسی کے اختیار کرنے میں دونوں قسم کے گناہ ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں مال کا ضیاع بھی ہوتا ہے، اس لئے فی نفسہٖ یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہے، لیکن سوال کے اندر ہندوستان میں آئے دن کے فسادات اور جان ومال کے جن خطرات اور نقصانات کی طرف نشاندہی کی گئی ہے، وہ بھی امر واقعہ ہے جو قابل توجہ ہے۔

ان حالات میں مجبوری اور ضرورت کی بنا پر محض حفاظت اور دفع مضرت کی نیت سے یا قانونی مجبوریوں کی وجہ سے اپنی جان اور املاک کا ''الضرر یزال'' کے فقہی قاعدے کے تحت بیمہ کرانے کی گنجائش ہوگی، کیونکہ بیمہ کرالینے کی صورت میں فسادیوں کی نظر بد سے املاک وغیرہ عموماً محفوظ ہوجاتی ہیں، لہٰذا مبتلا بہ حضرات کو شدید خطرات ونقصانات کا جب قوی اندیشہ ہو اور ظن غالب ہو اور املاک کی حفاظت کی اور کوئی صورت نہ ہو تو ایسے حالات میں بیمہ کرانے کی گنجائش ہے۔

بیمہ کرانے کے بعد جانی یا مالی نقصانات ہونے پر بیمہ کمپنی جو رقم دیتی ہے اس

میں قدرے تفصیل ہے، جیون بیمہ میں پالیسی مکمل ہونے کے بعد یا طبعی موت کے بعد جمع کردہ رقم سے زائد جو رقم ملتی ہے وہ قمار اور سود میں داخل ہوکر ناجائز ہوگی، لہذا وہ رقم فقراء پر واجب التصدق ہوگی، اور جو لوگ فساد میں ظلماً مارے جاتے ہیں تو حکومت پر قانوناً چونکہ جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری ہے اور اس کی عدم حفاظت سے جان ضائع ہوتی ہے، لہذا جمع کردہ رقم سے زائد رقم بطور ضمان حسب معاہدہ حکومت کی بیمہ کمپنی سے لینا درست ہوگا، اسی طرح ہمارے املاک کے تحفظ کی بھی ذمہ داری حکومت پر ہے لہذا فساد میں املاک کے ضیاع کی صورت میں جس قدر مالیت کا بیمہ کرایا گیا ہے، املاک کے تباہ ہوجانے کی صورت میں حکومت کی بیمہ کمپنی سے ملنے والی رقم کو ضمان قرار دے کر لینا مباح ہوگا، البتہ اگر خود مالک کے فعل سے نقصان ہوا اور املاک تباہ ہوگئیں تو اس صورت میں سرکاری بیمہ کمپنی سے ملی ہوئی رقم سے اپنی جمع کردہ رقم رکھ کر باقی رقوم کو تصدق کرنا واجب ہوگا، فقط۔ واللہ اعلم

حبیب الرحمٰن خیرآبادی، عفا اللہ عنہ،
مفتی دارالعلوم دیوبند، ۲۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۳/ جنوری ۱۹۹۱ء

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب، مفتی دارالعلوم دیوبند
حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند
حضرت مولانا مفتی کفیل الرحمٰن نشاط صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند

تصدیقات حضرات اساتذہ دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
حضرت مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند
حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند
حضرت مولانا محمد حسین صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
حضرت مولانا عبدالحق صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
حضرت مولانا ریاست علی صاحب استاذ حدیث وناظم مجلس تعلیمی دارالعلوم دیوبند
حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
حضرت مولانا قمر الدین صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
حضرت مولانا زبیر احمد صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا مجیب اللہ قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا مفتی محمد امین صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا شبیر احمد صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا مفتی محمد یوسف صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا محمد جمال صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا عبدالرؤف صاحب افغانی استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا شمیم احمد صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا نسیم احمد صاحب بارہ بنکوی استاذ دارالعلوم دیوبند
جناب مولانا خورشید انور صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

●●●

تجویز نمبر-۶
بیمہ پالیسی

مسلمانوں کے جان ومال کا حقیقی محافظ اللہ ہے، بیمہ پالیسی ربٰوا اور قمار کا مرکب ہے اور ان دونوں چیزوں کی حرمت منصوص ہے، لہٰذا خواہ جان کا بیمہ ہو یا املاک کا، بہرصورت حرام اور ناجائز ہے، اگرچہ جان کے بیمہ کی حرمت اموال کے بیمہ سے زیادہ سخت ہے۔

البتہ اگر کوئی قانونی مجبوری یا شدید ضرورت ہو تو مبتلا بہ ان صورتوں میں ارباب فتاویٰ سے رجوع کرنے کے بعد عمل کرے۔

(فقہی اجتماعات کے اہم فقہی فیصلے وتجاویز-تجاویز چھٹا فقہی اجتماع، ص ۴۹)

●●●

تجویز نمبر-۱
میڈیکل انشورنس اور اس کی چند شکلیں

۱۔ میڈیکل انشورنس پالیسی ہولڈر اور انشورنس کرنے والے ادارے کے درمیان ایسا معاہدہ ہے جس میں وہ ادارہ پالیسی ہولڈر سے یکمشت یا قسط وار متعینہ رقم وصول کرکے محدود مدت کے اندر اندر پالیسی ہولڈر کے کلی یا جزئی علاج یا اس کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور اگر محدود مدت کے اندر اندر پالیسی ہولڈر کو بیماری پیش نہ آئے تو جمع شدہ رقم واپس نہیں کی جاتی اور آج کل رائج میڈیکل انشورنس کی شکلیں دیگر انشورنس کی طرح قمار کے دائرے میں آتی ہیں اور ناجائز ہیں۔

۲۔ چونکہ اجتماع کے بعض شرکاء کی طرف سے مقالوں میں اور بحث کے دوران کچھ ایسی باتیں بھی سامنے آئی ہیں جن سے میڈیکل انشورنس کے قمار کے بجائے تعاون پر مبنی ہونے کا اشارہ ملتا ہے اس لئے یہ اجتماع مناسب سمجھتا ہے کہ ادارۃ المباحث الفقہیہ کی طرف سے علماء اور ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو انشورنس کمپنیوں کے اصول وضوابط اور مختلف شکلوں کا جائزہ لے کر اپنی تحقیق پیش کرے۔ اس کے بعد اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اس پر دوبارہ غور کیا جائے گا۔

۳۔ قانونی مجبوری کی صورت میں میڈیکل انشورنس کرانے کی گنجائش ہے اور زائد رقم کے بارے میں مبتلا بہ شخص اربابِ افتاء سے رجوع کرے۔

۴۔ ملازمین کے لئے غیر اختیاری انشورنس جس میں انشورنس کی رقم ان کی تنخواہوں

سے کمپنی ازخود کاٹ لیتی ہے یا وہ اپنے پاس سے جمع کراتی ہے تو اس طرح کی انشورنس پالیسی سے ملازمین کو فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے۔

۵۔ اسپتالوں کی طرف سے مخصوص بیماریوں کے علاج کے لئے جاری کئے جانے والے میڈیکل پیکج لے کر اس سے فائدہ اٹھانا جائز اور درست ہے۔

۶۔ حکومت غریبوں کے لئے بلا معاوضہ یا معمولی رقم بطور فیس لے کر کارڈ جاری کر کے جو طبی امداد فراہم کرتی ہے اس سے بھی انتفاع جائز ہے۔

۷۔ آج کل ایک طرف جہاں نت نئی بیماریاں عام ہیں وہیں ان کا علاج بھی گراں سے گراں تر ہوتا جارہا ہے خصوصاً اعضاء رئیسہ (دل گردہ وغیرہ) کا تعطل اور کینسر وغیرہ کا علاج ایک غریب بلکہ متوسط طبقے کے لئے بھی ناقابل تحمل ہے اس لئے بلاشبہ انسانی معاشرے کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ امداد باہمی کا ایسا نظام قائم کیا جائے جس سے ضرورت مندوں کا بروقت تعاون ہوسکے، اس لئے فقہی اجتماع تمام مسلم اداروں بالخصوص طب وصحت اور رفاہی خدمات سے جڑی ہوئی تنظیموں کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ اپنے اپنے دائرہ اثر میں منکرات ومحرمات سے بچتے ہوئے شرعی تکافل (امداد باہمی) کا نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس سلسلے میں اسلامی اصولوں پر مبنی تکافل کا جو طریقہ کار بعض مسلم ملکوں میں متعین کیا گیا ہے اس سے استفادہ کیا جائے۔

(فقہی اجتماعات کے اہم فقہی فیصلے وتجاویز، بارہوں فقہی اجتماع کا متفقہ فیصلہ، ص ۱۲۴-۱۲۵)

●●●

تجویز-۳

میڈیکل (ہیلتھ) انشورنس

بموقع: سترہواں فقہی اجتماع ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند، منعقدہ ۱۳ تا ۱۵ محرم الحرام ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲ تا ۱۴ اگست ۲۰۲۲ء بروز جمعہ، ہفتہ، اتوار، بمقام حج بھون، بنگلور، کرناٹک

صحت اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت ہے، اسی بنا پر اسلام میں حفظانِ صحت پر خاص توجہ دی گئی ہے، اس لیے تندرستی کا خیال رکھنا اور حسبِ وسعت بیماریوں کا علاج کرانا مشروع ہے۔ اسی کے پیشِ نظر مروجہ میڈیکل (ہیلتھ) انشورنس کے موضوع پر بحث کے بعد درج ذیل تجویز منظور کی گئی:

۵۔ موجودہ ملکی اور بین الاقوامی حالات کے تناظر میں کسی ناقابل تحمل بیماری میں مبتلا ہونے کے اندیشہ سے اگر ضرورت مند لوگ ''میڈیکل (ہیلتھ) انشورنس'' کی پالیسی سے استفادہ کریں تو اس کی گنجائش ہے۔

۶۔ انفراداً یا گروپ کی شکل میں ضرورۃً میڈیکل انشورنس کراتے وقت اگر کمپنی سے یہ معاہدہ کرلیا جائے کہ سالانہ پریمیم جمع کرنے کے عوض وہ سال میں کم از کم ایک مرتبہ اپنے ممبران کا میڈیکل چیک اپ ضرور کرائے گی، تو ایسے ہیلتھ انشورنس سے استفادہ کی بھی اجازت ہے، اور میڈیکل انشورنس کی یہ شکل ''عقود الصیانۃ'' (سروس کنٹراکٹ) کے مشابہ ہے۔

●●●

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا فیصلہ

(مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ نے ۱۹۶۵ء میں انشورنس کے سلسلہ میں جو فیصلہ کیا تھا، نیز ملک کی مؤقر درسگاہ ''دارالعلوم دیوبند'' سے اس بابت جو فتویٰ دیا جاچکا ہے) مجلس کے فیصلے اور دارالعلوم کے فتویٰ کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا مندرجہ ذیل فیصلہ کرتی ہے:

''مروجہ انشورنس اگرچہ شریعت میں ناجائز ہے کیونکہ وہ ربوا، قمار، غرر جیسے شرعی طور پر ممنوع معاملات پر مشتمل ہے، لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کی جان ومال، صنعت وتجارت وغیرہ کو فسادات کی وجہ سے ہر آن شدید خطرہ لاحق رہتا ہے، اس کے پیش نظر ''الضرورات تبیح المحظورات'' رفع ضرر، دفع حرج اور تحفظ جان ومال کی شرعاً اہمیت کی بنا پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں جان ومال کا بیمہ کرانے کی شرعاً اجازت ہے۔''(۱)

(اس فیصلہ پر ۵۳ علماء واصحاب افتاء کے دستخط ہیں)

●●●

(۱) واضح رہے کہ فقہ اکیڈمی کی طرف سے یہ تجویز اور سمینار میں شریک اہل علم کی طرف سے اس کی تائید کا یہ مطلب نہیں کہ انشورنس مسلمانوں کی حفاظت کا ضامن ہے، اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس انشورنس کے بعد جو بھی صورت پیش آئے اس میں ملنے والی سب رقم انشورنس کرانے والوں کے لئے جائز ودرست ہوگی، بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ کہ صرف فسادات کی صورت میں جان ومال کے نقصان کے بعد جو کچھ ملے اور جو حق قانون وضابطہ میں بتایا جائے، اس کے مطابق ملنے والا مال تو انشورنس کرانے والوں کے لئے جائز ودرست ہوگا اور بقیہ صورتوں میں صرف اپنی جمع کردہ رقم کے بقدر لینا اور استعمال کرنا جائز ہوگا، زائد کا نہیں، اور انشورنس کی صورت میں زائد کے جواز کی جہت حکومت کی نااہلی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے اس پر ضمان کی ہے۔

۲-میڈیکل انشورنس

شریعت اسلامی میں جوئے کی کوئی بھی شکل جائز نہیں، اس وقت میڈیکل انشورنس کی جو صورت رائج ہے وہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے جوا میں شامل ہے اور اس نے علاج کو خدمت کے بجائے نفع آور تجارت بنادیا ہے۔ اس پس منظر میں سمینار نے میڈیکل انشورنس کے بارے میں درج ذیل فیصلے کئے ہیں:

۱۔ میڈیکل انشورنس انشورنس کے دوسرے تمام شعبوں کی طرف بلاشبہ مختلف قسم کے ناجائز امور پر مشتمل ہے، لہذا عام حالات میں میڈیکل انشورنس ناجائز ہے اور اس حکم میں سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۲۔ اگر قانونی مجبوری کے تحت میڈیکل انشورنس لازمی ہو تو اس کی گنجائش ہے، لیکن جمع کردہ رقم سے زائد جو علاج میں خرچ ہو، صاحب استطاعت کے لئے اس کے بقدر بلانیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہے۔

۳۔ موجودہ مروج انشورنس کا متبادل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ممکن ہے اور آسان صورت یہ ہے کہ مسلمان ایسے ادارے ونظام قائم کریں، جن کا مقصد علاج ومعالجہ کے ضرورت مندوں کی ان کی ضرورت کے مطابق مدد کرنا ہو۔

(جدید مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، پندرہواں فقہی سمینار، ص ۲۲۶-۲۲۷)

●●●